انوکھے فسانے

حصّہ اوّل

محمد بدرالاسلام فضلی

مصنفہ شیخ محمد بدرالاسلام فضلی

(بسلسلہ اشاعت حالی اکیڈمی نمبر۲)

انوکھے فسانے

حصۂ اوّل

سُراغرسانی کے پانچ حیرت انگیز فسانے

شائع کردہ

حالی اکیڈمی پانی پت

۱۹۳۸ء

کیمیائی ہیرا

۱- مُہذّب ڈاکو

سہ پہر کے تین بجے تھے۔ بمبئی کی شاہراہوں پر حسب معمول بڑی چہل پہل تھی۔ تاج محل ہوٹل کے اندرونی دروازے کے سامنے ایک ٹیکسی آکر رکی۔ اُس میں سے دو شخص باہر نکل کر ہوٹل کے اندر داخل ہوئے اور دفتر میں جاکر دریافت کیا۔ "کیا مسٹر کنور سین نامی ایک صاحب آجکل یہاں مقیم ہیں؟" دفتر کے ایک کلرک نے فوراً رجسٹر کھول کر جواب دیا۔ "جی ہاں وہ یہاں ایک ہفتہ سے مقیم ہیں۔ کیا آپ اُن سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں؟"

ان دونوں نے اپنے کارڈ نکال کر کلرک کو دیئے۔ ان میں جو صاحب نہایت لحیم و شحیم تھے۔ اُن کے کارڈ پر انگریزی میں چھپا ہوا تھا۔

"رائے بہادر لالہ پرکاش نرائن، صدر انجمن جوہریان، دہلی"۔

کلرک نے گھنٹی بجائی جس کے جواب میں ہوٹل کا ایک ملازم حاضر ہوا۔ اُس نے

کارڈ دے کر ان حضرات کو جھک کر سلام کیا اور ہاتھ سے ایک جانب چلنے کا اشارہ کر کے خود پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کمرے کے سامنے پہنچ کر ملازم نے مسٹر کنور سین کو اطلاع دی جو اپنے مہمانوں کو لینے کے لئے خود باہر آئے اور نہایت تپاک سے مل کر اُن کو اندر لے گئے۔

مہمانوں نے میزبان کو جن نظروں سے دیکھا اُس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اپنے میزبان سے بالکل ناواقف تھے۔ گویا یہ پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ برخلاف اس کے میزبان کے چہرے پر اس قسم کے آثار نہ پائے جاتے تھے جن سے کسی قسم کی گھبراہٹ، بے چینی یا تذبذب پایا جائے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گویا ان مہمانوں کا گھنٹوں پیشتر سے انتظار کر رہا ہے۔

اُس کے لبوں پر تبسم تھا اور چہرے پر بشاشت۔ مگر وہ گفتگو شروع کرنے کے لئے ذرا بھی بے چین نہ تھا۔ بلکہ اپنے مہمانوں کو اس امر کا موقع دے رہا تھا کہ وہ اظہار مدعا کریں۔

رائے بہادر صاحب نے سوفے پر بیٹھتے ہی دو تین کروٹیں بدلیں۔ اپنی فلٹ کیپ اُتار کر میز پر رکھی۔ جیب سے رومال نکال کر مُنہ، سر اور گردن کا پسینہ خشک کیا۔ اِس دَوران میں نظر برابر مسٹر کنور سین کے چہرے پر جمی رہی۔

دوسرے صاحب جو دراز قد تیلے دُبلے تھے۔ سوفے پر اس طرح سمٹے سمٹائے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے تھے، جیسے بلّی کو دیکھ کر چُوہا کونے میں دبک جاتا ہے۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے مسٹر کنور سین کے مردانہ حُسن کا مشاہدہ کر لیتے تھے۔ اور پھر گھبرا کر اپنے ساتھی کو دیکھتے تھے۔ گویا زبانِ حال سے التجا کر رہے تھے کہ ہاں شروع

کیجیے۔

رائے بہادر صاحب نے پھر ایک بار رومال نکالا اور چاہتے تھے کہ پھر پسینہ پونچھیں۔ مگر خیال آیا کہ یہ لغو حرکت ہے۔ اس لیئے رومال کو فوراً جیب میں رکھ لیا اور کھنکار کر انتہائی کوشش کے ساتھ یوں سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

"جناب کو ہمارے کارڈ دیکھ کر یہ معلوم ہو چکا ہو گا کہ میرا..... نام...... پرکاش نرائن ہے اور دہلی میں جوہریوں کی جو ایسوسی ایشن ہے میں اُس کا پریسیڈنٹ ہوں۔ اور میرے ہمراہ یہ لالہ موہن لال ہیں جو اسی ایسوسی ایشن کے وائس پریسیڈنٹ ہیں........ جناب کا اسم شریف مسٹر کنور سین ہے؟

(میزبان نے گردن جھکا کر اقرار کا اشارہ کیا) امرتسر کے مشہور سیٹھ سادھو سنگھ صاحب میرے دوست ہیں۔ اُنہوں نے جناب سے غائبانہ تعارف کرایا ہے اور ہم لوگ اِس وقت جس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اُس کا علاج صرف آپ کے ہاتھ میں ہے۔

کنور سین۔ (پہلی بار بولتے ہوئے) میں خدمت کے لیئے ہر وقت حاضر ہوں۔ فرمائیے۔

رائے بہادر۔ میں پہلے تمام واقعات بیان کرتا ہوں۔ اور پھر عرضِ مدعا کروں گا........

"ایک ماہ کا عرصہ ہوا میرے ایک دوست پروفیسر لوس میرے مکان پر آئے اور اثنائے گفتگو میں سیم کے بیچ سے بڑا سفید رنگ کا ایک نگ نکال کر مجھے دکھایا اور پوچھا کہ اِس کی قیمت کیا ہو گی۔ میں نے پہلے تو یہ خیال کیا کہ پروفیسر کو یہ کیا

خبط سُوجھا کہ دو چار روپے کے نگ کی قیمت مجھ سے لگواتے ہیں۔ یا میرا مذاق اڑانا چاہتے ہیں۔ مگر پروفیسر کے متعلق میرا سابقہ تجربہ اِس کے بالکل برخلاف تھا۔ وہ نہایت خاموش اور متین آدمی ہیں اور سوائے اپنی سائنس اور لکچروں کے دُنیا کی کسی چیز سے اُن کو سروکار نہیں۔ خیر۔ میری حیرت کی اُس وقت انتہا نہ رہی جب میں نے بار بار بغور نگ کو دیکھنے کے بعد یہ معلوم کیا کہ نگ بے قیمت نہیں بلکہ بیش بہا ہیرا ہے۔ میری ساری عمر اسی کاروبار میں گذری ہے۔ اور ہزاروں ہیرے میرے ہاتھوں سے نکلے ہیں۔ مگر اُس روز میری عجیب کیفیت تھی کہ پروفیسر کی حالت پر غور کرتا تھا تو ہرگز ہیرے کے اصلی ہونے پر طبیعت نہ جمتی تھی۔ اُدھر اصل چیز صاف صاف اپنا عیب و ثواب ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے آخر پروفیسر سے دریافت کیا کہ یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا ہے ؟۔ مگر پروفیسر نے تُرش رُو ہو کر کہا۔ ”آپ کو اِس سے کیا مطلب آپ تو قیمت جانچ دیجئے“۔ آخر میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا کہ اگر آپ دینا چاہیں تو میں دس ہزار کا چک ابھی لکھ دوں۔

یہ سُن کر پروفیسر نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”واہ صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا“۔ میں بہت خفیف ہوا۔ کیونکہ میں نے اصل قیمت کا پانچواں حصہ بتلایا تھا۔ مجھے خوف ہوا کہ یہ کہیں اور بھی دکھا چکے ہوں گے اور دام یقیناً زیادہ لگے ہوں گے۔ اِس لئے میں نے دبی زبان سے کہا کہ اگر خریدار پیدا ہو جائے تو زیادہ دام بھی لگ سکتے ہیں۔ مگر ہمیں تو لے کر رکھنا پڑے گا۔ یہ سُن کر پروفیسر اور بھی زیادہ ہنسا۔ مجھے اپنے بیوقوف بننے پر غصہ بھی آ گیا

آخر پروفیسر نے کہا کہ "یہ ہیرا جس کی قیمت آپ دس ہزار بتاتے ہیں۔ میں نے خود کیمیائی اجزاء سے تیار کیا ہے۔" یہ سُن کر مجھے اور بھی حیرت ہوئی اور پھر میں نے خیال کیا کہ پروفیسر آج مذاق کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ مگر جب متانت کے ساتھ پروفیسر نے اصرار کیا تو یہ قرار پایا کہ میں ہیرے کو اپنے پاس رکھوں اور مزید جانچ کے بعد اس کے اصلی یا نقلی ہونے کا فیصلہ کروں۔"

اتنا کہہ کر رائے بہادر صاحب نے ذرا توقف کیا۔ اپنے ساتھی پر نظر ڈالی جو نیچی نظر کئے اپنی اُنگلیاں چٹخانے میں مصروف تھے۔ رائے بہادر صاحب نے ہونٹوں کو زبان سے تر کر کے سلسلۂ گفتگو یوں شروع کیا۔ "میں نے ہیرے کو ہر ممکن طریقہ سے جانچا۔ اور دو تین اور ماہروں کو دکھایا۔ ہیرا خواہ کان سے نکلا ہو یا کسی طرح بنایا گیا ہو۔ مگر اس بات میں ذرا شبہ نہ تھا کہ مال بیسوں بیس کھرا تھا۔"

میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے قبل بھی اکثر لوگوں نے کیمیائی طریقے سے ہیرا بنانے کی کوشش کی ہے۔ مگر ہمیشہ ناکامیابی ہوئی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس مصنوعی طریقے سے تیار کرنے میں اول تو صرف چھوٹے چھوٹے الماس بن سکتے ہیں۔ دوسرے لاگت کان سے نکلے ہوئے ہیرے سے بھی زیادہ پڑتی ہے۔ علاوہ بریں ہم کو یہ بھی شبہ تھا کہ کہیں اس میں کوئی چال نہ ہو۔ اس لئے میں نے پروفیسر سے دریافت کیا کہ اُن کا مقصد کیا ہے؟ تو اُنہوں نے نہایت سادگی سے یہ فرمایا کہ میں اپنی اس ایجاد کے متعلق یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ عنقریب انگلستان جا کر رائل سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے ایک

مضمون پیش کروں - اور اُس کے ممبروں کے سامنے عملی تجربہ بھی دکھاؤں۔
میں نے دریافت کیا اس عملی تجربہ کے عوض رائل سائنٹفک سوسائٹی کسقدر
رقم آپ کو پیش کرے گی۔ بوڑھے پروفیسر نے گردن ہلا کر کہا کہ تم تجارتی لوگ
ہر چیز سے روپیہ کمانے کی فکر میں رہتے ہو۔ مجھے اس سے کسی دولت کمانے
کا لالچ نہیں۔ صرف بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے اِس اِنکشاف کا اظہار
ضروری خیال کرتا ہوں۔

غرض یہ کہ بمشکل میں نے پروفیسر کو اس بات پر راضی کر لیا کہ انگلستان
جانے سے قبل وہ عملی تجربہ ہمارے سامنے کریں۔ چنانچہ تاریخ و وقت مقرر
ہو گیا - اور میں اپنی انجمن کے تمام ممبروں کو لے کر پروفیسر کے مکان پر پہنچا۔ مگر
پروفیسر مکان سے غائب تھا۔ آدھ گھنٹے تک انتظار کرنے کے بعد ہم نے
خیال کیا کہ یہ سب جھوٹی کارروائی تھی - اور آزمائش کے خوف سے پروفیسر
بھاگ نکلا۔ ہم لوگ باہم گفتگو کر ہی رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور
پروفیسر مُسکراتے اور معافی مانگتے ہوئے اندر آئے معلوم ہوا کہ پروفیسر نے
ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ لکچر دینے کی دھن میں بالکل بھول گئے تھے۔ خیر
اب پروفیسر نے جیب سے عینک نکال کر لگائی اور پھر جلد جلد اپنی تمام جیبوں
کی تلاشی لی اور بہت سے پھٹے چرے کاغذوں کا ایک ڈھیر نکال کر میز پر
رکھا اور مسکرا کر ہم سے کہنے لگا۔ ”اگرچہ کیمیائی ہیرا بنانے کا طریقہ تو نہایت ہی
آسان ہے لیکن مختلف اجزاء کے نام جن کی تعداد ۳۷ ہے اور ان کی مقدار
یاد رکھنا سخت دشوار ہے اِس لئے میں نے کاغذ پر یادداشت لکھ رکھی ہے۔“

یہ کہہ کر پروفیسر نے تمام کاغذات کئی بار اِدھر سے اُدھر اُلٹ پلٹ ڈالے
میں نے پوچھا۔ "تو بغیر یادداشت آپ ہیرا تیار نہیں کر سکتے ؟"۔ پروفیسر نے
جواب دیا۔ "بیشک ناممکن نہیں تو ازحد دشوار ضرور ہے۔ کیونکہ مجھے کم از کم تین
ماہ پھر محنت کرنی پڑے گی جب دوبارہ یادداشت تیار ہو سکے گی"۔ میں نے
حیرت سے پوچھا۔ "پھر ایسی بیش قیمت چیز کو آپ ردّی کاغذوں کی طرح کیوں
لئے پھرتے ہیں۔ اگر جیب سے کہیں گم ہو جائے ؟"۔ پروفیسر نے گھبرا کر کہا
"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں گر ہی گیا کیونکہ اِن کاغذات میں تو نہیں ملتا"۔

وہ شبہات جو کچھ دیر قبل پروفیسر کے آجانے پر ہمارے دلوں سے دور
ہو گئے تھے اب پھر قوی ہو گئے۔ مگر ذرا دیر بعد پروفیسر اُچھل پڑے۔ "مل گیا!
مل گیا!!"

اب پروفیسر نے ہم لوگوں سے کہا کہ "آپ لوگ اِس برقی بھٹی کے قریب
آجائیں تاکہ تجربہ اچھی طرح دیکھ سکیں"۔ چنانچہ ہم لوگ اُس میز کے گرد بیٹھ
گئے جس پر وہ بھٹی لگی ہوئی تھی۔ بعد ازاں پروفیسر نے ایک گیند جیسی گول ڈبیا
نکالی جو بیچ میں سے کھلتی تھی۔ اُس کو بھی میں نے دیکھ لیا یہ بھی کسی دھات
کی بنی ہوئی معمولی ڈبیہ تھی۔ مگر پروفیسر نے بتایا کہ یہ عجیب کرشمہ اِسی ڈبیا
کی کرامات ہے۔ اب پروفیسر نے دواؤں کی ۳۷ شیشیاں میز پر رکھ
کر ہم سے پوچھا کہ "کس رنگ کا ہیرا آپ چاہتے ہیں ؟"۔ ہم لوگوں نے گلابی
رنگ کا ہیرا طلب کیا۔ پروفیسر نے ۵ شیشیاں اور نکالیں۔ اب کاغذ سے دیکھ
کر پروفیسر نے ہر شیشی سے اجزا نکال نکال کر نہایت احتیاط کے ساتھ

تولے اور مجھے دیتے گئے۔ میں نے اُن کو اس گول ڈبیا میں ڈالا اور اپنے ہاتھ سے بند کر کے بھٹی میں رکھ دیا۔

پروفیسر نے بھٹی کا دروازہ بند کر کے بجلی کی کرنٹ چھوڑ دی۔ اور ہم سے کہہ دیا کہ "آپ تین گھنٹے انتظار کیجئے"۔ پھر خود میز کے ایک کونے پر بیٹھ کر کچھ کاغذات جیب سے نکالے اور حساب وکتاب میں مشغول ہو گیا۔

ہم سب لوگ بھی خاموش دم بخود بیٹھے رہے۔ یہ نہ پوچھئے کہ تین گھنٹے کیونکر گذرے۔ پروفیسر کے لئے تو یہ ایک کھیل سا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اگر یہ دعویٰ سچا تھا تو ہم لوگوں کے لئے اور تمام دُنیا کے جوہریوں کے لئے تو اس سے بڑی مصیبت خیال میں بھی نہ آسکتی تھی۔ وہ ہیرا جو آج قیمتی چیز خیال کی جاتی ہے کل اگر کیمیائی اجزاء سے بن کر کنج کے مول فروخت ہونے لگے گا تو پھر جو اربوں روپیہ اس کاروبار میں ہمارا لگا ہوا ہے سب مٹی ہوا۔ ہم لوگوں کو تو مزدوری کر کے پیٹ پالنا بھی دُوبھر ہو جائے گا۔ غرض یہ کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے خیال میں محو تھا۔ مگر ٹکٹکی سب کی بھٹی کی طرف بندھی ہوئی تھی بھٹی کی گرمی قیامت خیز تھی۔ کمرہ دوزخ کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ تین گھنٹے گویا تین برس ہو گئے۔ خدا خدا کر کے یہ وقت ختم ہوا۔ پروفیسر نے گھڑی دیکھ کر بجلی کی کرنٹ بند کر دی۔ مگر بھٹی کے ٹھنڈے ہونے میں ابھی دو گھنٹے کی اور دیر تھی۔ یہ دو گھنٹے بھی گذارے۔ ہماری جان نکلی جاتی تھی مگر پروفیسر کو اتنی فکر بھی نہ تھی جتنی کمہار کو چاک پر بیٹھ کر۔

دو گھنٹے کے بعد پروفیسر نے اجازت دی۔ بھٹی کھولی گئی۔ ہمیں سے جس

سنسی سے ڈبیا نکالی۔ پروفیسر نے ایک اور بڑی ڈبیہ میں اُس کو رکھ کر میرے حوالے کیا اور کہہ دیا کہ "جب یہ ٹھنڈی ہو جائے تو اس کو کھول کر اس میں سے ہیرا نکال لیجئے۔ یہ ہیرا نا تراشیدہ ہوگا"!

میں اپنے تمام احباب کو ساتھ لے کر اپنی دُکان پر آیا۔ اور اُسی وقت ہیرا تراشنے والے کو بلا کر اپنے سامنے ڈبیا کھول کر ایک سیاہ ڈلا نکالا اور اُس کو دے دیا۔ اُس نے اُسی وقت اُس میں سے کاٹ کر ایک دھیلے کے برابر گلابی ہیرا دوسرا کابلی چنے کے برابر اور کئی چھوٹے چھوٹے ہیرے نکالے۔ یہ سب مال کم از کم دو ڈھائی لاکھ روپے کا مول تھا۔ تمام ممکن طریقوں سے ہم نے اطمینان کر لیا کہ یہ ہیرے بالکل اصلی ہیں۔ اب ہماری تمام اُمیدوں کا خاتمہ ہوگیا۔ شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ لیکن میں نے ایک آخری کوشش اور کی۔ پروفیسر سے مل کر اُن کو اپنی مشکلات سمجھائیں۔ اور یہ بتایا کہ اُن کو صرف شہرت حاصل ہوگی۔ لیکن سینکڑوں گھرانے برباد ہو جائیں گے، مگر صاحب! پروفیسر بھی عجیب کھوپری کا انسان ہے۔ لاکھ سر مارا۔ مگر اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہی کہتے رہے کہ اِس انکشاف سے سائنس کو یہ فائدہ ہوگا اور بنی نوعِ انسان کو یوں نفع پہنچے گا۔ جب سمجھانے سے راضی نہ ہوئے تو انجمن کی طرف سے میں نے ڈھائی لاکھ کی رقم اُن کی خدمت میں پیش کی۔ اس شرط پر کہ وہ اِس انکشاف کو اپنے تک محدود رکھیں مشتہر نہ کریں۔ مگر جب اُنہوں نے اس بیشمار دولت کو بے اعتنائی سے ٹھکرا دیا تو میں نے سمجھ لیا کہ یہ شخص ضرور پاگل ہے۔ تاہم ایسا خیال کر لینے سے ہماری مشکلات میں کوئی کمی نہیں ہوئی

ہمیں اطلاع مل چکی ہے کہ پروفیسر پندرہ روز بعد انگلستان روانہ ہونیوالے ہیں"۔
رائے بہادر نے دفعتاً محسوس کیا کہ واقعات ختم ہو چکے ہیں اور عرض مدعا کا نازک فرض ادا کرنے کا وقت آپہنچا۔ وہ طبعاً پُرگو آدمی ہیں۔ اس لئے جُوں جُوں گفت گو کا سلسلہ دراز ہوا وہ واقعات کے بیان کرنے میں ایسے محو ہو گئے جیسے ایک شطرنج کا کھلاڑی۔ کھیل میں دنیا و مافیہا کو فراموش کر دیتا ہے اُن کو خود اپنی باتوں میں لطف آرہا تھا۔ اور وہ یہ بھول چکے تھے کہ جس شخص سے وہ یہ واقعات بیان کر رہے ہیں وہ دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک انسان ہے جس نے جرائم کو ایک مستقل آرٹ بنالیا ہے۔ رائے صاحب اگرچہ اس شخص کے کارناموں سے تو واقف نہ تھے، مگر جس شخص نے تعارف کرایا تھا، مندرجہ بالا امور ضرور بتادئے تھے۔ چنانچہ سلسلۂ گفتگو ختم ہوتے ہی وہ گویا خواب سے چونک پڑے اور گھبراکر اپنے ساتھی کو دیکھا جس کے چہرے پر انتہائی وحشت کے آثار طاری تھے اور جسم اس طرح بے حس و حرکت تھا جیسے مسمریزم کے معمول کا۔ اُس سے مایوس ہو کر انہوں نے مسٹر کنورسین کے مسکراتے ہوئے چہرے اور چمکتی ہوئی متجسس نگاہوں کو دیکھا اور گھبراکر اپنا پہلا فقرہ پھر دُہرایا۔ "ہم لوگ جس مشکل میں اس وقت گرفتار ہیں اُس کا علاج صرف آپ ہی کے پاس ہے"۔ مگر جواب بھی نپا تُلا پھر وہی ملا۔
"میں خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ فرمائیے"۔
رائے بہادر صاحب۔ "میرا منشا یہ ہے کہ اگر پروفیسر نے یہ انکشاف مشتہر کر دیا تو ہم لوگ بالکل برباد ہو جائیں گے"۔

مسٹر کنور سین۔ "اچھا تو آپ چاہتے ہیں کہ پروفیسر کو خاموش کر دیا جائے"۔

رائے بہادر۔ (خوش ہو کر) "جی ہاں! یہی عرض ہے"۔

کنور سین۔ "اِس خدمت کی فیس؟"۔

رائے بہادر۔ "جو آپ مانگیں"۔

کنور سین۔ "دس لاکھ جس میں سے نصف پیشگی ادا کرنے پڑیں گے نصف کام ہو جانے کے بعد۔ اگر آپ کو یہ شرائط منظور نہ ہوں تو آپ کا راز بالکل محفوظ ہے اطمینان رکھئے"۔

رائے بہادر صاحب نے بلا توقف جیب سے چک نکال کر پانچ لاکھ روپے کا چک لکھا۔ اور کنور سین کو دیتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ چار روز کے بعد یہ چک بینک کو پیش کر دیں گے تو میں ممنون ہوں گا۔ کیونکہ دہلی پہنچتے ہی رقم کا انتظام کر کے میں بینک میں داخل کرا دوں گا"۔

۲۔ قتل کی دھمکی

کپتان عباس علی خان۔ وی سی اپنی کوٹھی کے دیوان خانے میں ایک آرام کرسی پر لیٹے ہوئے سیٹی بجا رہے ہیں۔ اور مشغلہ بیکاری کے طور پر گذشتہ زمانے کی یاد سے دل بہلا رہے ہیں۔ اپنی تعلیم کا زمانہ علی گڈھ کالج کا ہفت سالہ قیام اور اس کی دلچسپیاں یاد آ کر دل میں چٹکیاں لے رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں اُن کو اپنا وہ لقب یاد آیا جس سے وہ کالج میں مشہور تھے

اُن کی وحشیانہ جسمانی قوت، ڈیل ڈول اور چہرے کے عجیب کینڈے کی مناسبت
سے اُن کے دوست اُن کو بُل ڈاگ کہا کرتے تھے۔ اس کے بعد جنگ یورپ
کے واقعات، اپنے جنگی کارنامے، اور اعزاز، یورپین ممالک کی سیر، یہ تمام واقعات
ایک ایک کرکے چشم تصور کے سامنے آئے، اور کپتان نے ایک آہِ سرد بھری۔ اب
زندگی دلچسپی سے خالی نظر آتی تھی اور بیکاری سے اُن کی طبیعت سخت گھبراتی تھی
دوست شادی کرنے کا مشورہ دیتے تھے، مگر اُن کی آزاد پسند طبیعت اِس جنجال
میں پڑنے کے لئے تیار نہ ہوتی تھی۔ یہاں تک پہنچ کر اُنہوں نے شادی کے فوائد
ونقصانات پر غور کرنا شروع ہی کیا تھا کہ دفعتًا دروازہ کھلنے کی آواز سے چونک پڑے
ایک سن رسیدہ شخص مغربی لباس پہنے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوئے۔

"آہا میرے پیارے پروفیسر! آئیے، آئیے! کیوں کیا ہوا؟ کیا شہد کی
مکھی نے کاٹ کھایا؟" پروفیسر بوس کے چہرے پر واقعی ایسے ہی آثار پائے جاتے
تھے جن سے انتہائی روحانی اذیت کا پتہ چلتا تھا۔ کپتان کے بے محل مذاق پر
ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اوّل تو پروفیسر نے تیوری پر بل ڈال کر کپتان کو گھور کر
دیکھا اور پھر جیب سے ایک کاغذ نکال کر کپتان کو دیا اور خود صوفے پر بیٹھ گئے، بلکہ یوں
کہئے کہ نیم مدہوشی کی حالت میں گر گئے اور ایسی نظروں سے کپتان کی طرف دیکھنے لگے
جن سے رحم کی التجا ٹپکتی تھی۔ کپتان نے اُس تحریر کو پڑھ کر کاغذ میز پر رکھ دیا۔

"پروفیسر صاحب معاف کرنا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ معاملہ اس قدر خطرناک ہے
لیکن حیرت یہ ہے کہ آپ جیسے شخص سے کسی کو اس درجہ دشمنی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے
کہ جان لینے کی دھمکی دے۔"

عباس! مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ میرے ہوش وحواس درست نہیں ہیں تمھاری مدد مانگنے آیا ہوں۔ بتاؤ میں کیا کروں؟ تم جانتے ہو کہ میں اِن معاملات سے بالکل بے خبر ہوں۔" پروفیسر نے کرسی کی پشت سے کمر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر ایک دم چونک کر بولے۔ "کالج ہی میں مجھے یہ خط ملا بھیجنے والے کا نام اس میں لکھا نہیں، مجھے کیا معلوم کس نے لکھا ہے؟ ہاں ایک بات بار بار میرے دماغ میں آرہی ہے۔ میں کیمیائی ہیرا بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے اس کا اظہار رائے بہادر لالہ پرکاش نرائن سے کر دیا تھا۔ آپ اُن کو جانتے ہیں اچھا خیر، یہ جوہری ہیں بلکہ جوہریوں کی انجمن کے پریسیڈنٹ ہیں۔ اُن کی فرمائش پر میں نے اُن کو اور اُن کے دوستوں کو عملی تجربہ بھی کر کے دکھایا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے یہ حماقت کیوں کی؟ خیر چند روز کے بعد رائے بہادر صاحب نے مجھ سے کہا کہ ڈھائی لاکھ روپیہ لے کر میں یہ علمی انکشاف دنیا پر ظاہر نہ کروں۔

کپتان نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "اب میں سمجھ گیا تو یہ رائے بہادر صاحب ہی کی کارروائی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں بھی تو ڈھائی لاکھ روپیہ کا ذکر موجود ہے۔"

پروفیسر۔ "مگر بھائی! رائے بہادر کو میں مدتوں سے جانتا ہوں وہ ایسے آدمی ہرگز نہیں۔ یہ کوئی نہایت ہی بدمعاش آدمی معلوم ہوتا ہے۔ لکھا ہے کہ یا تو میں ڈھائی لاکھ روپیہ قبول کروں، ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر ایسے بدمعاش آوارہ لوگ آزاد پھرتے ہیں تو پھر گورنمنٹ اس قدر روپیہ پولیس پر کیوں خرچ کرتی ہے؟"

کپتان۔ "مگر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ نے ڈھائی لاکھ روپیہ کیوں نہ لے لیا

اتنی دولت سے تو آپ خود پوری ایک فوج نوکر رکھ کر اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔"

پروفیسر - (جوش سے اُچھل کر) "کیا کہا عباس! کیا تم چاہتے ہو کہ میں روپے کے بدلے علم کی ہتک کر دوں؟ ایک میری اکیلی جان کیا، اگر دس جانیں بھی جاتی رہیں تو حق کے اظہار سے کوئی میری زبان روک نہیں سکتا۔ علم کی قربان گاہ پر مجھ سے زیادہ قیمتی جانیں بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ میں بھی بخوشی جان دے دوں گا، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ایسے اہم انکشاف کو چھپاؤں۔"

کپتان - "شاباش پروفیسر! میں آپ کی زبان سے یہی سُننا چاہتا تھا واقعی اِن بدمعاشوں کو کیا حق حاصل ہے کہ آپ پر نامناسب دباؤ ڈالتے ہیں۔ مگر آپ کی ایجاد سے اب تک کتنے لوگ واقف ہیں؟"

پروفیسر - "صرف جوہریوں کی انجمن۔"

کپتان - "خوب، آپ کے پاس اس کی کوئی یادداشت بھی ہے؟"

پروفیسر - "ہاں ہاں، اگر یادداشت نہ ہو تو خود میں بھی یہ تجربہ نہیں کر سکتا۔ دیکھئے میری جیب میں ...."

یہ کہہ کر پروفیسر نے جیبیں ٹٹولیں اور کچھ کاغذات کا ڈھیر نکالا اور جلدی جلدی اُن کو اِدھر اُدھر کرنے لگے۔ پھر جیب سے نکال کر عینک لگائی اور گھبرا کر کہنے لگے "یہ تو بچوں کی غذا کے متعلق کچھ نئی تحقیقات کا مصالحہ ہے ...... وہ ہیرے والا کاغذ بار بار کہاں گم ہو جاتا ہے ...... اہا یہ رہا، مل گیا۔"

پروفیسر نے ایک ردی کاغذ جس پر کچھ عجیب وغریب نقوش بنے ہوئے تھے اُس ردی کے ڈھیر سے علیحدہ کیا اور کپتان کو دیا۔ باقی کاغذات جیب میں

ٹھونس لئے۔ وہ کاغذ کپتان نے دیکھا۔ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اُردو، فارسی، ہندی، اتنی زبانیں جانتے ہوئے وہ اس کاغذ کی تحریر پڑھنے سے قطعاً عاجز تھا۔ مگر اُس کو حیرت تھی تو یہ کہ ایسی بیش قیمت چیز جس کی وجہ سے خود پروفیسر کی زندگی اس وقت خطرے میں ہے، پروفیسر نے اس لاپرواہی کے ساتھ جیب میں ٹھونس رکھی ہے

کپتان نے خاموشی کے ساتھ ایک لفافہ میں یہ کاغذ بند کیا اور اُس پر لاکھ کی مہر لگائی۔ پھر پروفیسر نے کہا۔ "اب اس کو تو میرے پاس چند روز کے لئے رہنے دیجئے۔ اور آپ اسی وقت کرنل رابرٹسن سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کے پاس چلے جائیے۔ میں آپ کو خط لکھے دیتا ہوں، وہ میرے گہرے دوست ہیں۔ آپ اُن سے تمام واقعات بیان کر کے یہ گمنام خط جو آپ کے نام آیا ہے، دے دیجئے گا، وہ آپ کی حفاظت کا انتظام کر دیں گے۔"

پروفیسر (گھڑی دیکھ کر) "لیکن آج تو مجھے فرصت نہیں، دیکھئے دو بج چکے ہیں۔ میرے ایک مدراسی دوست ڈاکٹر آئنگر کا تار آج صبح میرے نام آیا ہے تین بجے وہ مجھ سے ملنے کے لئے آ رہے ہیں۔ کاربن کے متعلق میں نے ایک مضمون سائنٹفک ریویو میں لکھا تھا، اُس کے متعلق وہ بحث کرنا چاہتے ہیں اور اپنی تحقیق کو ثابت کرنے کے لئے بہت سے نمونے بھی ہمراہ لائیں گے۔ میں بے چینی کے ساتھ اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں، کیونکہ اگر وہ اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سائنس کی دُنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو جائے گا۔" پروفیسر کہتے کہتے جوش میں کھڑے ہو گئے۔ "بس اب اجازت دیجئے، کل کسی وقت پھر آپ سے ملوں گا۔"

کپتان - "مگر آپ کو اپنی جان زیادہ عزیز ہے یا ڈاکٹر آئنگر کی بحث؟"

پروفیسر - "ارے میاں مرنا جینا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ بھلا خیال کرو ایک ایک ایسا زبردست فاضلِ روزگار مجھ سے ملنے کے لئے کوسوں دور کی مسافت طے کر کے چلا آ رہا ہے، اور میں وقت مقررہ پر گھر سے غائب ہو جاؤں، یہ بھی کوئی انسانیت ہے، بس اب جانے دو۔"

کپتان - "خیر آپ جانیئے، میرا تو یہ خیال تھا کہ کم از کم یہاں سے جاتے ہوئے راستے میں کرنل سے دفتر میں ملتے جائیے۔"

پروفیسر - "مگر دیر ہو چکی ہے، مجھے گھر تک پہنچنے میں ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت لگے گا، شکنتلا اور اُس کی ماں دونوں گھر میں نہیں ہیں، نوکر میری پاگل سی ہے ڈاکٹر آئنگر اگر مجھ سے پہلے پہنچ گئے تو بڑی شرمندگی ہو گی۔ تو بس اب میں جاتا ہوں"

کپتان - "ہاں، مگر یہ تو بتانے جائیے کہ ڈاکٹر آئنگر کو آپ کتنے عرصہ سے جانتے ہیں۔ اُن سے پہلے کبھی ملے بھی ہیں؟"

پروفیسر - "ہاں ہاں تقریباً تین برس ہوئے میں اُن سے آل انڈیا سائنٹفک کانفرنس میں ملا تھا۔"

۳- ایک حادثہ

ہندو رائے کے باڑے میں ہسپتال کے پیچھے ایک چھوٹا سا بنگلہ ہے اُس میں پروفیسر بوس رہتے ہیں۔ ٹھیک تین بجے ایک کار اُس بنگلہ کے سامنے

آکر رکی۔ پہلے ایک مدراسی اُس میں سے اُترا، پھر اُس کے پیچھے دو نہایت مضبوط لمبے چوڑے آدمی برآمد ہوئے۔ موٹر کے پیچھے جو بہت بڑا صندوق رسیوں سے بندھا ہوا تھا، اُن دونوں نے اُس کو کھولا اور اُٹھوا کر مکان کے اندر لے گئے اس وقت بنگلہ میں سوائے ایک خادمہ کے کوئی موجود نہ تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کی آمد سے واقف تھی، کیونکہ اُس نے بغیر کچھ تحقیقات کئے ہوئے وہ کمرہ کھول دیا، جو ڈاکٹر کی نشست گاہ بھی تھی اور دارالعمل بھی، ابھی تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ پروفیسر بوس بھی آپہنچے اور کمرے میں داخل ہوتے ہی رسمی الفاظ دہرائے اور دیر ہو جانے کی معذرت چاہی۔ تھوڑی دیر بعد جب خادمہ اُس دروازے کی طرف سے گذری تو کمرے کا دروازہ اُس نے بند پایا، مگر اندر سے پروفیسر بوس اور اُن کے دوست ڈاکٹر آئنگر کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ یہ خادمہ بیس برس سے ڈاکٹر آئنگر کے یہاں ملازم تھی، مگر بولنے والوں کی آوازوں میں سے ایک اُس کو یقینی طور پر پروفیسر بوس ہی کی آواز معلوم ہوئی۔ ایک گھنٹہ کے بعد نوکر کے کمرے میں بجلی کی گھنٹی بجی، اور نوکر گھبرا کر پروفیسر بوس کے کمرے کی طرف آئی۔ اُس وقت اُس نے کمرے کے باہر سے اچھی طرح دیکھا کہ پروفیسر بوس اپنی کرسی پر میز کے سامنے بیٹھے ہیں، اور گردن جھکائے ہوئے ان چیزوں کو دیکھ رہے ہیں جن کا میز پر ڈھیر لگا ہوا ہے۔ مدراسی ڈاکٹر کے دونوں آدمی اُس کا بھاری صندوق اُٹھا کر باہر لے جا رہے ہیں اور خود مدراسی ڈاکٹر کمرے سے باہر نکل رہا ہے۔ مگر کمرے سے نکلتے ہی اُس نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا

اچھا پروفیسر خدا حافظ۔ دیکھو! ذرا احتیاط سے تجربہ کرنا کہیں بارود سے گھری نہ جل جائے"۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر آنگر تو بیرونی دروازے کی طرف مڑے مگر خادمہ نے پروفیسر بوس کی آواز سنی۔ "مہری دو گھنٹے تک میرے کمرے میں کوئی نہ آئے" مہری نے آہستہ سے کمرے کے دروازہ پر ہاتھ رکھا، وہ اندر سے بند ہو چکا تھا باہر آئی تو صندوقی موٹر کے پیچھے بندھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خادمہ بنگلہ کے پیچھے کی طرف صحن میں بیٹھ کر برتن مانجھنے لگی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد اس زور کا دھماکا ہوا کہ مہری اوندھے منہ گر پڑی اور چند منٹ بعد جب ہوش و حواس درست ہوئے تو فوراً اٹھ کر پروفیسر کے کمرے کی طرف بھاگی بنگلہ کے سامنے کا حصہ اینٹ چونے اور مٹی کا ڈھیر ہو گیا تھا جس کمرے میں پروفیسر تھے اس کی کرسیاں، میزیں، الماریاں، آلات، ادویات، کتابیں سب جل کر خاک سیاہ ہو گئے تھے۔ ہوا میں اس قدر سخت بدبو تھی کہ مہری پھر بیہوش ہو کر گرنے لگی، مگر ایک شخص نے اس کو سنبھالا۔ چند منٹ میں ہزاروں آدمی سڑک پر جمع ہو گئے پولیس آ گئی، انسپکٹر نے فوراً مہری کو علیحدہ لے جا کر اس کا بیان لیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پروفیسر بوس جو مشہور سائنٹسٹ تھے کسی قسم کے خطرناک آتش گیر مادے کا تجربہ کر رہے تھے، اور جیسا اکثر ایسی حالت میں ہو جاتا ہے، تجربہ کامیاب نہ ہوا اور ڈاکٹر نے اپنی جان سائنس کی قربان گاہ پر نثار کر دی۔ پولیس نے بھیڑ کو پیچھے ہٹا کر مکان پر قبضہ کر لیا اور ایک گھنٹہ کے بعد مکان کی کھدائی شروع کرا دی، مگر ڈاکٹر کے جسم کا کوئی حصہ برآمد نہ ہوا۔ صرف ایک جوتہ ملا جس کو مہری نے بھی پہچانا۔ علاوہ بریں اسی وقت کپتان عباس علی خان بھی آ پہنچے۔ انہوں نے اس جوتے کو

پہچان لیا، کیونکہ اُس پر دو جوڑ لگے ہوئے تھے اور آج صبح ہی جب پروفیسر بوس اُن سے ملنے کے لئے گئے تھے تو انہوں نے یہ جوتے دیکھے تھے۔

ابھی کپتان یہیں موجود تھے کہ ایک موٹر بنگلہ کے سامنے آکر رُکی اور ڈاکٹر آئنگر نہایت غمگین صورت بنائے ہوئے اُس میں سے اُتر کر انسپکٹر کے پاس آئے اپنے نام کا کارڈ دے کر اُنہوں نے یہ بیان کیا کہ "میں مدراس یونیورسٹی میں کیمسٹری کا پروفیسر ہوں، اور کاربونیفرس کوارٹز کے متعلق بحث کرنے کے لئے خاص پروفیسر بوس ہی کے پاس آیا تھا۔ ایک گھنٹہ تک میں نے اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو کی، مگر وہ اُس وقت ایک خاص قسم کے آتش گیر مادے پر تجربہ کر رہے تھے۔ میں نے اُن کو منع بھی کیا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ تجربہ کامیاب نہیں ہو سکتا مگر وہ قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔ چنانچہ ابھی میں اپنی قیام گاہ تک بھی نہ پہنچا تھا کہ مجھے اس حادثہ کی اطلاع ملی اور میں فوراً واپس آیا (آبدیدہ ہو کر) حضرات! میں آپ لوگوں سے ذاتی واقفیت نہیں رکھتا مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پروفیسر کی بے وقت موت سے نہ صرف میں نے ایک مخلص دوست کھو دیا، بلکہ علمی دنیا کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوا جس وقت اس سانحے کی خبر یورپ و امریکہ پہنچے گی تو ایک کہرام مچ جائے گا۔"

مجمع کو چیر کر کپتان عباس علی خان آگے بڑھے اور ڈاکٹر آئنگر سے مصافحہ کیا ڈاکٹر نے اُن کی طرف اس طرح دیکھا کہ گویا پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے نہیں جانتے۔ ڈاکٹر بوس میرے مشفق اُستاد تھے، اور آپ کے دوست، اس لئے میں نے آپ کو تعارف کی زحمت دی۔"

ڈاکٹر آئنگر۔ "جناب کا نام؟"

عباس علی خان"

ڈاکٹر آئنگر۔ "جناب کیا عرض کروں۔ اس حادثہ نے مجھے ایسا صدمۂ عظیم پہنچایا ہے کہ میرے حواس بجا نہیں ہیں۔ مجھے فوراً مدراس واپس جانا تھا۔ وہاں عنقریب ہندوستان کے بڑے بڑے سائنس دانوں کا مجمع ہونے والا ہے میں خود اس جلسہ کا صدر ہوں۔ پرسوں تک تو میں کہیں جا نہیں سکتا۔ کیونکہ ڈاکٹر بوس کی تجہیز و تکفین میں شریک ہونا میرا اخلاقی فرض ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر آئنگر نے پھر کپتان سے مصافحہ کیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر چل دیا کپتان بھی دو چار قدم آگے بڑھا اور ایک دوسری ٹیکسی میں داخل ہوا۔ کپتان کا اشارہ پاتے ہی ڈرائیور نے ڈاکٹر آئنگر کی ٹیکسی کا پیچھا کیا اور یہ دونوں ٹیکسیاں ایک دوسرے کے پیچھے رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں غائب ہو گئیں۔

۴۔ ایک دن میں تین واقعات

کپتان عباس علی خان اپنی کوٹھی کے آراستہ ڈرائنگ روم میں ایک آرام کرسی پر دراز سگار کے بڑے بڑے کش لے رہے ہیں۔ چہرہ پر تفکر کے آثار نمایاں ہیں ان کے قریب ہی ایک چھوٹی گول میز پر صبح کی ڈاک اور اخبارات رکھے ہوئے ہیں۔ خدا جانے کیا فکر ہے کہ اب تک ڈاک دیکھنے کی نوبت نہیں آئی کمرے کے باہر سے پہلے منہ سے سیٹی بجانے کی آواز آئی پھر ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شخص خادم سے جھگڑا کر رہا ہے مشکل سے ایک منٹ گذرا ہو گا کہ دروازہ کھلا

سے کھلا اور علی شیر خاں صاحب نہایت بے فکری سے بید گول گھماتے اور سیٹی بجاتے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے خادم بھاگا ہوا آیا اور ہانپتے ہوئے پیچھے سے ان کے کوٹ کا دامن پکڑ کر کھینچا، اور کہنے لگا۔ "ذرا ٹھیرئیے ٹھیرئیے! باہر چلئے اجازت نہیں ہے"۔ علی شیر خاں نے ہشت کہتے ہوئے جھٹکا دے کر اپنا دامن چھڑایا اور نوکر پر غضب آلود نگاہیں ڈال کر ایک صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ نوکر اب بھی تشدد پر آمادہ تھا۔ مگر عباس علی خاں نے اُس پر ایک ایسی پُر معنی نظر ڈالی کہ غریب خاموش ہو کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

عباس علی خاں۔ "کیوں جی یہ کیا بیہودہ حرکت ہے۔ بغیر اجازت کوٹھی میں گھسے چلے آتے ہو"۔

علی شیر خاں۔ "کیا کہا کچھ گھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟ کیا رات نشہ کیا تھا؟ اجازت اور ہمارے لئے"؟

عباس علی خاں۔ "مُسکراتے ہوئے"۔ "یار علی شیر میں اس وقت اپنے خیالات میں بالکل مستغرق تھا۔ تمہاری آمد نے سارے خیالات درہم برہم کر دیے"۔ "میں بھی تو سنوں کہ آخر آپ کو کون سی فکر لاحق ہوئی۔ کیا کسی خطاب کے لئے کوشش کر رہے ہیں، یا آپ کا سپاہیانہ دل کسی زلفِ گرہ گیر کے دام میں پھنسا ہے"؟

عباس علی خاں۔ بھائی میں سچ کہتا ہوں یہ مذاق کا وقت...... "؟

دروازہ کھلا، اور نوکر نے ایک نقرئی کشتی میں ایک ملاقاتی کارڈ کپتان کے سامنے پیش کیا۔ کپتان نے کارڈ دیکھ کر ملازم سے کہا۔ "جو صاحب آئے ہیں اُن کو بلا لاؤ"۔ ایک لمحہ کے بعد ڈاکٹر آشگر کمرے میں داخل ہوئے اور رسمی الفاظ

کے بعد کپتان کے بالمقابل ایک صوفے پر بیٹھ گئے، اور سلسلۂ کلام یوں شروع کیا
"کیا کپتان عباس علی خاں آپ ہی ہیں؟ شاید میں نے آپ کو کہیں پہلے بھی
دیکھا ہے۔ میں نے اس وقت ایک خاص مقصد کے لئے جناب کو تکلیف دی ہے
میرے مرحوم دوست جن کی اچانک موت کا حادثہ پرسوں شام ہی پیش آیا ہے
شاید آپ کے اُستاد تھے؟"

کپتان۔ "جی ہاں فرمائیے۔"

"اس حادثہ سے آدھ گھنٹہ پیشتر میں اُن کی خدمت میں حاضر تھا انہوں
نے مجھ سے ذکر کیا کہ حال ہی میں اُنہوں نے کیمیائی اجزاء سے اصلی ہیرا بنانے کا
ایک کامیاب طریقہ ایجاد کیا ہے جس کو وہ انگلستان جاکر رائل سائنٹفک سوسائٹی
کے سامنے عملی طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ وہ ایک خطرناک تجربہ کرنے والے
تھے اس لئے اُنہوں نے مجھے یہ بھی بتادیا تھا کہ اس کیمیائی ہیرے کا نسخہ اُنہوں نے
کسی وجہ سے آپ کے پاس رکھوایا تھا۔ اُن کی وصیت ہے کہ اگر اُن کی موت
واقع ہوجائے تو یہ نسخہ میں آپ سے لے کر اور انگلستان جاکر اُن کی طرف سے
رائل سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے پیش کردوں۔ چنانچہ میں یہ امانت لینے کے
لئے حاضر ہوا ہوں۔" اس تقریر کے دوران میں کپتان کی متجسس نگاہوں نے
ڈاکٹر آئنگر کا پوری طرح جائزہ لے لیا تھا اور کپتان کو یہ پورا یقین ہوگیا تھا کہ یہ
شخص ہر لحاظ سے کیمسٹری کا پروفیسر ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ مگر تیز نگاہوں
نے یہ دیکھا کہ ڈاکٹر آئنگر نے اپنے بائیں ہاتھ کی بیچ کی اُنگلی سے اپنے بائیں گھٹنے
پر ہتھوڑی کی طرح کئی بار چوٹ لگائی اور ہر بار ہاتھ کھینچ کر جیب میں رکھ لیا۔

کپتان ۔"یہ وصیت زبانی تھی یا تحریری؟"

"تحریری وصیت تھی، جو اُنہوں نے لفافہ میں بند کر کے اور اپنی مہر لگا کر اپنے وکیل لالہ طوطا رام صاحب کے پاس بھیج دی تھی ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کسی وقت آج ہی وکیل کے پاس تشریف لے چلیں تاکہ وصیت نامہ لے کر ڈاکٹر بوس کی امانت میرے حوالے کر دیں۔"

کپتان ۔"بہت خوب! لالہ طوطا رام صاحب کا دفتر ایجرٹن روڈ پر ہے نہ؟ تو میں ٹھیک چار بجے وکیل صاحب کے دفتر میں آپ سے ملوں گا۔"

ڈاکٹر آنگر رخصت ہوئے، اور دونوں دوست تنہا رہ گئے ۔ علی شیر نے نہایت تعجب سے کپتان کی زبانی تمام واقعات سُنے، اور آخر میں پوچھا ۔"تو پھر کیا تم یہ نسخہ ڈاکٹر آنگر کو دے دو گے؟"

کپتان ۔"یقیناً اگر وصیت نامہ موجود ہے تو یہ امانت اپنے پاس رکھنے کا مجھے کیا حق حاصل ہے؟"

"مگر یار کپتان! مجھے تو اس معاملہ میں سازش کی بو آتی ہے۔"

"شاباش صاحبزادے! ہو نہ آخر شکاری کُتّے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ واقعات بہت دلچسپ ہوتے جا رہے ہیں ۔ اور اگر خدا کو منظور ہے تو دو چار روز اچھی خاصی دل لگی رہے گی۔"

"مگر یار یہ ڈاکٹر آنگر تو محض جُغدِ صحرائی معلوم ہوتا ہے ۔ آپ نے دیکھا کوٹ کے دامن میں کتنے دھبّے لگے ہوئے تھے۔"

"خیر اب گیارہ بج چکے ہیں، کھانا کھا لیجئے تو پھر شکار کی تلاش میں چلیں۔"

ٹھیک گیارہ بجے کپتان عباس علی خاں اور شیر علی خاں چاندنی چوک میں جوہریوں کی انجمن کے صدر لالہ پرکاش نرائن کی دوکان کے سامنے موٹر سے اُترے دُکان میں داخل ہوتے ہی لالہ پرکاش نرائن کے نوجوان سیکرٹری چودھری راجپال سنگھ استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ راجپال سنگھ اُن چند خوش قسمت انسانوں میں سے ہیں، جن کو زمانۂ تعلیم سے کپتان کے دوست اور ہم سبق ہونے کا فخر حاصل تھا۔ راجپال سنگھ نے ہاتھ ہلاتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔ "آپ یہاں کہاں؟"

عباس علی۔ "آپ کے آقائے نامدار لالہ پرکاش نرائن بہادر سے دو باتیں کرنی ہیں۔"

راجپال سنگھ۔ "کیوں کیا شادی کا ارادہ ہے؟"

عباس علی۔ "یہ کیا بے تکا سوال ہے، یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں جواہرات خریدنے کے لئے آیا ہوں؟ اگر یہی ارادہ ہوتا تو آپ کیا تھوڑے تھے؟"

راجپال سنگھ۔ "بھئی کپتان! لالہ صاحب تو اس وقت بہت مصروف ہیں، جوہریوں کی انجمن کا ایک خاص جلسہ ہو رہا ہے۔"

عباس علی۔ "جی ہاں مجھے یقین تھا کہ اس وقت جوہریوں کی انجمن کا اجلاس ہو رہا ہوگا۔ بس آپ جلدی سے جائیے، اور لالہ پرکاش نرائن سے اتنا کہہ دیجئے کہ عباس علی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

راجپال سنگھ۔ "بھئی میں تو بالکل معذور ہوں، مجھے سخت تاکید ہے کہ اس وقت کوئی نہ آنے پائے۔"

عباس علی - "اسی لئے تو مجھے بھی اصرار ہے"۔

راجپال سنگھ - "آخر کچھ معلوم تو ہو کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟"

علی بشیر - "راجپال آج تمہیں کیا ہو گیا کہ تم کپتان سے اتنی جرح کر رہے ہو کیا اس سے پہلے کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ ہماری پارٹی کے آدمی بغیر چون و چرا اور اصل واقعہ معلوم کئے ہوئے خطرناک سے خطرناک کام اس شخص کے کہنے سے کرتے رہے ہیں۔ مجھے دیکھو صبح سے قیدیوں کی طرح ساتھ ساتھ ہوں مجھے خود خبر نہیں کہ کس بھاڑ میں لے جا کر جھونکیں گے۔ بس صبر کرو، اور دم دبا کر جاؤ اور لالہ صاحب کو خبر کر آؤ"۔

راجپال سنگھ عجیب تذبذب کی حالت میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دکان سے بالاخانہ پر گیا اور چند منٹ کے بعد واپس آکر نہایت حیرت کے لہجہ میں کپتان سے کہا۔ "جائیے بلاتے ہیں"! کپتان اپنے دونوں ساتھیوں کو نیچے چھوڑ کر بالاخانہ پر گیا جہاں لالہ پرکاش نرائن اپنی انجمن کے بارہ ممبروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ لالہ پرکاش نرائن نے کھڑے ہو کر کپتان کا استقبال کیا اور کپتان سے ہاتھ ملا کر کرسی پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا، مگر کپتان نے کھڑے رہنا پسند کیا۔ اس لئے لالہ صاحب کو بھی اخلاقاً کھڑے رہنا پڑا۔

لالہ پرکاش نرائن - "کپتان عباس علی خاں جناب ہی کا نام ہے؟ اس وقت میں ایک اشد ضروری کام میں مشغول تھا، اس لئے اگر آپ تشریف آوری کا مقصد مختصر بیان فرمائیں تو میں ممنون ہوں گا، اور اگر ممکن ہو تو ملاقات کسی اور

وقت پر ملتوی رکھئے"۔

کپتان (نہایت اطمینان سے) "میں تو صرف اتنا دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ کیا آپ ڈاکٹر بوس سے واقف ہیں؟" لالہ صاحب نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور کچھ تامل کے بعد کہا۔ "جی ہاں جانتا ہوں، مگر وہ تو پرسوں ایک حادثہ میں مر چکے ہیں"۔

کپتان "اُنہوں نے ہیرا بنانے کا ایک کیمیائی طریقہ ایجاد کیا تھا اور اس کا عملی تجربہ آپ سب صاحبان کو بھی دکھایا تھا۔ (لالہ صاحب کے چہرہ پر کچھ پریشانی کے آثار نمودار ہوئے) وہ اپنی یہ ایجاد انگلستان کے ماہرینِ سائنس کے رُوبرُو پیش کرنا چاہتے تھے لیکن ایسا کرنا جوہریوں کے مفاد کے خلاف تھا، اِس لئے اُن کو ایک بہت بڑی رقم کا لالچ دیا گیا، اور جب ڈاکٹر نے اُس کے قبول کرنے سے اِنکار کیا تو اُن کو جان کی دھمکی دی گئی۔ اُسی روز وہ حادثہ پیش آیا جو ڈاکٹر کی موت کا باعث ہوا۔ مگر خوش قسمتی سے وہ نسخہ میرے پاس موجود ہے جس کو ڈاکٹر نے یہ وعدہ لے کر میرے سپرد کیا تھا کہ اگر دھمکی حقیقت بن جائے تو میں اُن کی اِس قابلِ قدر ایجاد کو دُنیا کے سامنے پیش کر دوں"۔

لالہ صاحب۔ "کیا کیمیائی طریقے سے ہیرا بنانے کا نسخہ آپ کے پاس ہے؟"

کپتان۔ "جی ہاں! اور عنقریب میں اُس کو شائع کرنے والا ہوں"۔

لالہ صاحب۔ "مگر یہ تو حادثہ کے وقت ڈاکٹر کے پاس موجود تھا"۔

کپتان۔ "جی ہاں کم از کم آپ لوگوں کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ نسخہ ڈاکٹر

کے ساتھ فنا ہو چکا، مگر یہ صحیح نہیں (جیب سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے) یہ ہے وہ لفافہ، جس کے اندر ڈاکٹر نے وہ نسخہ بند کر کے لفافہ پر اپنی مہر لگا دی ہے، اچھا تو اب مجھے اجازت ہے؟"

لالہ صاحب۔ "ذرا تشریف تو رکھئے"۔

کپتان۔ "میرا تو کوئی ہرج نہیں، ہاں بے شک آپ کا ہرج ضرور ہو رہا ہوگا"۔

"معاف کیجئے گا۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں، کہ آپ نے ابھی یہ الفاظ جو فرمائے تھے کہ ہمیں یقین دلایا گیا اِس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"میرا صرف یہ مطلب ہے کہ اُس شخص نے جو اس حادثہ کا ذمہ دار ہے آپ کو اطمینان دلایا ہوگا کہ آپ کی تجارت محفوظ ہے، اگر وہ ایسی غلط بیانی نہ کرتا تو اپنا معاوضہ کیونکر پاتا؟"

"نہیں جناب ہم ہرگز اِس معاملہ میں شریک نہ تھے یعنی ہمارا مقصد یہ نہ تھا کہ ڈاکٹر کو کچھ نقصان پہنچے۔ ہم تو صرف اتنا چاہتے تھے کہ یہ ایجاد کسی طرح ضائع ہو جائے"۔

"جی ہاں اُس کے ضائع کرنے کے لئے موجد کی جان لینی بھی ضروری تھی، اور جب اس کام کے لئے آپ ایک بیش قرار معاوضہ دے رہے تھے تو پھر ایک مشہور بدمعاش اور ماہر فن مجرم کو کیا تامل ہو سکتا تھا، مگر اس کام کے لئے جو انتخاب آپ نے کیا تھا مجھے بھی اُس کی داد دینی پڑتی ہے"۔

لالہ پرکاش نرائن کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا پیشانی پر پسینہ کے بڑے بڑے قطرے نمودار تھے۔ ان کے ساتھیوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی، مگر خود ان کی

حالت بدترین تھی۔ اُنہوں نے ایک بار پھر تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جناب ہم لوگ ایک انتہائی مصیبت میں گرفتار تھے، اور اس کے سوا کوئی تدبیر نہ تھی۔"

کئی جوہری ایک ساتھ بول کر۔ "حضور ہمارا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں خود پرکاش نرائن ہی اس کے ذمہ دار ہیں یہی اُس آدمی کے پاس گئے۔ معاملہ ٹھیرایا۔ ہم سے تو انہوں نے آج بیان کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے تو ہم میں سے بھی ایک کی جان لے ڈالی۔ بے چارہ موہن لال اُسی دن سے گھر سے غائب ہے، کچھ خبر نہیں کہاں گیا ہے۔"

کپتان۔ "خیر جناب مجھے ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو صرف یہ عرض کرنے آیا تھا کہ نسخہ میرے پاس ہے۔ جسے میں کسی قیمت پر فروخت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ رہی میری جان سو اس کی حفاظت کا ذمہ دار میں خود ہوں، آپ اطمینان رکھیں۔" یہ کہہ کر کپتان جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا۔ × × × ×

× ×

"نمبر ۱۷- ایجرٹن روڈ لالہ طوطا رام وکیل کا کمرہ"۔ کپتان نے اپنی موٹر میں بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو ہدایت دی۔ مشکل سے دس منٹ گذرے ہوں گے کہ موٹر بازار سے گذرتی ہوئی وکیل صاحب کے کمرے کے نیچے رکی۔ کپتان اُتر کر بالاخانہ پر گیا۔ ڈاکٹر آنگرہ پہلے سے کمرے میں موجود تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد تینوں کرسیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ لالہ طوطا رام نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا، "اوہو ساڑھے چار بج گئے، اور مجھے آج فٹ بال کا میچ دیکھنے کے لئے جانا ہے۔ آپ ہی کی خاطر سے رکا ہوا تھا، بس جو کام کرنا ہے جلدی سے کر لیجئے۔"

کپتان۔ "جی ہاں! وہ وصیت نامہ نکالیے"۔ بوڑھے وکیل نے پہلے عینک لگائی۔ پھر میز پر سے ایک کاغذ اٹھا کر غور سے دیکھا اور کپتان کی طرف بڑھایا۔ کپتان نے اس کو پڑھ کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ وصیت نامہ پر ڈاکٹر بوس ہی کے دستخط تھے، اور صاف لکھا تھا کہ کیمیائی ہیرے کا نسخہ جو عباس علی خاں کے پاس امانت ہے، اُن سے لے کر ڈاکٹر آہنگر کو دے دیا جائے۔ اب چون و چرا کا کوئی موقع باقی نہ تھا۔ کپتان نے اندر کی جیب سے وہ لفافہ نکالا جس میں کیمیائی ہیرے کا نسخہ بند تھا اور باحتیاط وکیل صاحب کے سپرد کر دیا۔ کپتان کی تاڑنے والی نظر دیر سے ڈاکٹر آہنگر پر جمی ہوئی تھی۔ دفعتاً اُس نے دیکھا کہ ڈاکٹر آہنگر نے اپنا بایاں ہاتھ جیب سے نکالا، اور اُس ہاتھ کی بیچ کی اُنگلی کو بائیں ٹانگ کے گھٹنے پر ہتھوڑی کی طرح چند بار مارا۔ کپتان نے جھپٹ کر ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ غریب چیخ اُٹھا، اور اس غیر متوقع حرکت پر نہایت برہم ہو کر زور سے بولا "یہ کیا کرتے ہو جی؟" کپتان نے ان کا کالر پکڑ کر ایک اور جھٹکا دیا، ڈاکٹر نے غصہ میں چیخنا چلانا شروع کیا، اور اس سے زیادہ بوڑھے وکیل نے چلانا شروع کیا۔ "ارے کوئی ہے؟ ارے او گھاسی کہاں مر گیا؟ پولیس بلاؤ، یہ کیا غضب ہے، میرے سامنے اور یہ زیادتی؟" اِدھر یہ دونوں بوڑھے چیخ رہے تھے، گھاسی کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ برابر والے کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور ایک سیاہ فام دیو پیکر عورت ایک مدراسی وضع کی سفید ساڑھی باندھے ایک لمبی جلانے کی لکڑی ہاتھ میں لئے بھاگی ہوئی کمرے کے اندر آئی، اور بلا تامل پے در پے آدھی درجن ضربیں کپتان کی کمر پر رسید کیں۔ اگرچہ کپتان نے

جنگ یورپ میں بڑے بڑے سورما سپاہیوں کا مقابلہ کیا تھا، مگر اس عورت کے ساتھ جو اس عجیب و غریب آلۂ حرب کے ساتھ مسلح تھی اور ایک ناقابلِ فہم زبان میں کپتان کو ہزاروں گالیاں سنا رہی تھی بجز شکست کے چارہ نظر نہ آیا۔ ڈاکٹر آہنگر نے جو اپنی اہلیہ محترمہ کی بے پناہ چڑھائی کے باعث دشمن کی گرفت سے چھوٹ کر ایک کونے میں پناہ لے چکے تھے۔ جو اس برجا ہونے پر اپنی خاص زبان میں بیوی کو جنگ بند کرنے کا حکم دیا، مگر نہایت برہم ہو کر انگریزی میں وکیل صاحب سے کہنے لگے۔ "اگر کپتان صاحب نے مجھ سے معافی نہ مانگی تو ضرور اس معاملہ کو عدالت تک پہنچاؤں گا۔"

کپتان۔ "مجھے سخت ندامت ہے، مجھ سے جو حرکت اس وقت سرزد ہوئی ہے، آپ سب لوگ حیران ہوں گے، مگر اس وقت میں ایک غلط فہمی کا شکار بن گیا۔ بعض وجوہات کی بناء پر میں نے خیال کیا کہ آپ اصلی ڈاکٹر آہنگر نہیں ہیں کیا میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کو اس خاص کام کے لئے کس شخص نے یہاں بلایا ہے اور کیا معاوضہ دیا ہے؟"

آہنگر۔ "جب تک آپ معافی نہ مانگیں گے، میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہ دوں گا۔"

کپتان۔ "میں نہایت ادب سے معافی مانگتا ہوں۔"

آہنگر۔ "اگرچہ میرا ہاتھ بہت بری طرح سے دکھ رہا ہے اور شاید پندرہ روز سے پہلے درست نہ ہو گا لیکن خیر میں معاف کرتا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں ایسی صورت پیش آنے والی ہے تو میں ہرگز یہاں نہ آتا۔

سّو روپے کیا چیز ہیں۔ اگر کوئی ہزار روپے بھی دیتا تو میں یہاں نہ آتا۔ مجھ سے تو صرف یہ کہا گیا تھا کہ بس ایک گھنٹہ کا کام ہے۔ آج صبح ہم دونوں میاں بیوی ملدراس سے ہوائی جہاز میں روانہ ہوئے۔ چار بجے یہاں پہنچے۔ اب ہمارا ہوائی جہاز تیار ہو گا۔ ٹھیک پانچ بجے ہم یہاں سے واپسی کے سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ آنے جانے کا کرایہ تو بلانے والے ہی نے دیا ہے۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ سیر کی سیر ہو جائے گی اور مفت میں سّو روپے ملیں گے۔ بس اتنا ہی تو کام ہے کہ یہ کاغذ آپ سے لے کر اُس کو دے دوں گا۔"

وکیل۔ "لیجئے لیجئے یہ کاغذ لیجئے۔ خواہ مخواہ اتنی دیر ہو گئی۔ میچ شروع ہو گیا ہو گا۔ میں تو اب جاتا ہوں۔"

آئنگر۔ "ہاں ہاں چلئے، ہمارا ہوائی جہاز بھی تیار ہو گا۔"

کپتان۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا ہوائی جہاز کہاں سے جائے گا؟"

آئنگر۔ "صفدر جنگ سے۔ جنہوں نے مجھے بلایا ہے، اُن کی کوٹھی بھی وہاں سے قریب ہی ہے۔ نمبر ۶۲ اسوکا روڈ۔"

۵۔ سازش

اُسی روز شام کو ۶ بجے کپتان اسوکا روڈ کوٹھی نمبر ۶۲ میں داخل ہوا کوٹھی بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ کم از کم اس وقت وہاں کوئی موجود نہ تھا

کپتان نے پوری طرح اطمینان کرکے گول کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کمرہ نہایت معقول طریق پر آراستہ تھا اور تمام دروازوں پر گہرے نیلے رنگ کے نیچے نیچے پردے پڑے ہوئے تھے۔ بظاہر یہ کمرہ بالکل خالی معلوم ہوتا تھا۔ دو تین منٹ تک کپتان بغور ہر چیز کو دیکھتا رہا۔ آخر اُسے کچھ ایسا شبہ ہوا کہ ایک پردے کے پیچھے کوئی چیز متحرک ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹایا مگر پردے کے پیچھے کوئی نظر نہ آیا۔ اُس نے سوچا کہ یا تو صرف وہم و گمان تھا، یا پردہ ہوا سے ہلا تھا۔ اس پردے کے پیچھے ایک زینہ کا دروازہ تھا۔ کپتان بلا تامل اوپر چڑھ گیا اور بالاخانہ پر پہنچ کر ایک گیلری سے گذرا اور پھر ایک کمرے میں داخل ہوا۔ اس تمام کمرے میں کپتان کے لئے سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ایک چھوٹی سی سنگار میز تھی۔ اس سنگار میز کے دونوں طرف کئی کھونٹیاں دیوار پر نصب تھیں جن میں سے بعض پر عجیب و غریب قسم کے لباس ٹنگے ہوئے تھے اور بعض پر کچھ مصنوعی ڈاڑھیاں اور بال آویزاں تھے اور میز پر بہت سی شیشیاں رکھی تھیں جن پر مختلف رنگ کے خضاب وغیرہ تھے۔ کپتان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب اُس نے دیکھا کہ انہیں لباسوں میں ڈاکٹر آئنگر کا سیاہ بند گلے کا لمبا کوٹ بھی تھا جس کے دامنوں پر تیزاب کے کئی دھبے پڑے ہوئے تھے۔ کپتان ان چیزوں کے دیکھنے میں مشغول تھا، مگر وہ عادتاً ہمیشہ ہوشیار رہتا تھا۔ اُس نے پھر ایک بار محسوس کیا کہ اُس کی پشت پر جو دروازہ تھا اُس کا سیاہ پردہ ہل رہا ہے۔ کپتان نے دفعتہً پلٹ کر پردہ کھینچ لیا، مگر اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک چھوٹی سی میز پر سے ٹیلیفون ریسیور اُٹھایا اور پیغام سننے لگا

"ہیلو میں ہوں، کنور سین۔ کوٹھی نمبر ۵ہم قرول باغ۔ کیا تم ہو جے مل؟"

کپتان (آہستہ سے) "جی ہاں۔"

پیغام۔ "آئنگر اور اس کی بیوی تو ہوائی جہاز پر مدراس روانہ ہو چکے ہوں گے ہا جے مل وہ نوکر جو جاسوسی کے لئے میں نے اُس بھولے پروفیسر کے ساتھ وکیل کے ہاں بھیجا تھا واپس آگیا ہے۔ اُس کی زبانی بہت دلچسپ حالات سُنے۔ میری تدبیر کارگر ہوئی، وہ کل کا لونڈا عباس علی پھر میرے معاملہ میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑا رہا تھا میں نے بھی کیا خوب سبق پڑھایا ہے بچہ کو مدتوں یاد رہے گا۔ بیچارے نے مدتوں سے یہ سمجھ رکھا تھا کہ میری پہچان کے لئے یہی کافی ہے کہ میں اکثر عادتاً اپنے بائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی سے اپنے بائیں گھٹنے کو ٹھونکتا رہتا ہوں۔ آئنگر کو میں نے دس روپے زیادہ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وکیل کے یہاں وہ دو تین دفعہ ایسا کرے۔ بڈھے پروفیسر کو کچھ شبہ تو ہوا تھا مگر دس روپے کے لالچ میں آگیا ...."

کپتان اس دلچسپ گفتگو میں ایک لمحہ کے لئے ایسا محو ہوا کہ اُس جیسے باخبر آدمی کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اُس کی پشت کی طرف جو سیاہ پردہ تھا وہ بیچ میں سے کُھلا اور نہایت مضبوط ہاتھ ایک وزنی ہتھوڑا لئے ہوئے باہر نکلا ہتھوڑا اس زور سے کپتان کے سر پر پڑا کہ ریسیور ہاتھ سے چھوٹ گیا اور کپتان کی لاش زمین پر گری۔ سر سے خون کے فوارے چھٹنے لگے۔ مارنے والا فوراً باہر آیا۔ جُھک کر لاش کو سیدھا کیا اور غور سے چہرہ کو دیکھا جس پر سیاہی دوڑ چکی تھی پھر جلدی سے گرا ہوا ریسیور اُٹھایا اور یہ پیغام بھیجا۔ "آپ مطمئن رہیں کام

بن گیا، شکار جال میں پھنس گیا۔"

ٹیلیفون پر دوسری طرف سے آواز آئی۔ "کہیں مر تو نہیں گیا؟"

اِدھر سے۔ "مرا نہیں تو مرنے کے قریب ضرور ہے۔ سر سے خون بہت نکل رہا ہے۔"

اُدھر سے۔ "خون بند کرنے کی فوراً تدبیر کرو، اور میرا شکار زندہ سلامت نشیمنِ عقاب میں پہنچاؤ۔ خبردار تمھاری ذمہ داری ہے۔"

۷۔ نشیمنِ عقاب

دہلی سے جنوب مشرق کی طرف جمنا پار ایک چھوٹی سی بستی سلیم پور ہے اگرچہ اب اِس میں پچاس ساٹھ گھروں سے زیادہ آباد نہیں رہے لیکن ویران حویلیوں کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی کسی زمانہ میں اچھا بڑا قصبہ ہوگا۔ بوڑھے لوگوں سے سُنا ہے کہ کسی زمانہ میں ایک خوشحال منڈی تھی، مگر ریلیں جاری ہوئیں اور سلیم پور ان سے محروم رہا۔ حتّٰی کہ اب قریب ترین ریلوے اسٹیشن بارہ تیرہ میل کے فاصلہ پر ہے اور پکّی سڑک بھی کم از کم چھ سات میل دور ہے۔ ایسے ناساعد حالات میں منڈی بھلا کہاں قائم رہ سکتی تھی اور جب منڈی نہ رہی تو قصبہ کی رونق اور آبادی کیونکر برجا رہتی۔ لازمی نتیجہ ویرانی ہوا۔

میر علی حسن ایک زمانہ میں سلیم پور اور اُس کی اراضیات کے واحد مالک

بنتے، مگر ان کی خوش حالی فضول خرچی، مقدمہ بازی اور قرض کے نذر ہو چکی ہے
اب صرف اتنا ہی باقی رہ گیا ہے کہ پیٹ بھر لیتے ہیں اور تن ڈھک لیتے ہیں۔
ان کے دادا میر اولاد حسین صاحب نہایت منتظم آدمی تھے۔ اُنہوں نے گاؤں
سے باہر دو تین میل کے فاصلہ پر ایک بہت وسیع باغ لگایا تھا، اور ایک شاندار
بارہ دری اس کے اندر تعمیر کرائی تھی۔ سلیم پور اور اس باغ کے درمیان
ڈھاک کا جنگل تھا۔ خدا جانے باغ لگاتے وقت اِس بات کو کیوں نظر انداز کر دیا
گیا تھا۔ بہر حال غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے یہ بارہ دری کبھی آباد نہ ہوئی اور اب
تو مدتوں سے بدنظمی کے باعث باغ بھی اُجڑا پڑا تھا۔ کئی بار میر صاحب نے اپنی
ضروریات کی وجہ سے اس باغ اور بارہ دری کو علیحدہ کرنا چاہا مگر خریدار
پیدا نہ ہوا۔ تقریباً ایک مہینہ کا عرصہ ہوا کہ ایک باہر کا آدمی میر صاحب کے پاس
آیا اور اُن سے بیان کیا کہ وہ مرزا غضنفر بیگ کا مختار ہے، جو رنگون میں پچیس
برس تک نہایت کامیاب بیرسٹر رہ چکے ہیں اور مدت دراز کے بعد اپنے وطن
دہلی واپس آئے ہیں چونکہ اُن کے خاندان کے لوگوں اور پرانے احباب میں
سے اب کوئی دہلی میں باقی نہیں ہے، اس لئے دہلی کی رہائش سے وہ سخت
بیزار ہیں۔ وہ پُرسکون زندگی کے خواہاں ہیں۔ مطالعہ کتب سے اُن کو عشق ہے
پچاس ساٹھ ہزار کتابیں اُن کے پاس موجود ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ کسی ایسی
جگہ مکان بنائیں جہاں دُور دُور تک آبادی نہ ہو، جنگل کی صاف ہوا ہو چاروں
طرف خوشنما مناظر ہوں اور اِس کُنجِ عافیت میں بیٹھ کر وہ آرام سے مطالعہ
کتب میں اپنی زندگی گذاریں۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ تیار ہوں تو آپ کا

باغ اور بارہ دری خرید لیں۔ اس کی قیمت دس بارہ ہزار تک دینے کے لئے تیار ہیں بارہ ہزار کا نام سُن کر میر صاحب کے مُنہ میں پانی بھر آیا اور بغیر سوچے سمجھے باغ بیچنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اگلے ہی روز رجسٹری ہو گئی اور فوراً ہی پچاس ساٹھ آدمیوں کی مدد لگا کر نہایت تیزی کے ساتھ باغ اور ملحقہ عمارت کی درستگی شروع ہو گئی حتٰے کہ ہزاروں روپیہ صرف کر کے دہلی سے اس کوٹھی تک بجلی کے تار بھی آ گئے اور کوٹھی ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ ہو کر مرزا غضنفر بیگ کی رہائش کے قابل بن گئی اور اُن کا کتب خانہ بھی لکڑی کے بڑے بڑے اور وزنی صندوقوں میں کوٹھی پر آ پہنچا۔ گرد و نواح میں اِس تبدیلی کی بڑی شہرت ہوئی ہے اور سلیم پور میں تو لوگ ہر وقت اسی کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اور اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یا تو اِس کوٹھی کی حفاظت کے لئے ایک چھوٹی سی فوج رکھنی پڑے گی، ورنہ ایک نہ ایک دِن اِس پر بہت بڑا ڈاکہ پڑے گا۔ اِس کوٹھی کے متعلق سب سے زیادہ حیرت انگیز بات اُس کا نام ہے۔ کوٹھی کے دروازے پر سنگِ مرمر کی ایک لوح نصب ہے، جس پر "نشیمنِ عقاب" کندہ ہے۔ بیچارے میر صاحب کے پاس گاؤں کے بے فکرے جاہل و نیم جاہل اکثر اس عجیب و غریب نام کے معنے پوچھنے کے لئے آتے ہیں۔

مرزا صاحب کو کوٹھی میں آئے چار روز ہو چکے ہیں۔ یہ بات مشہور ہو رہی ہے کہ مرزا صاحب اہل و عیال نہیں رکھتے۔ ان کے ایک بڑے بھائی دیوانے ہیں، وہ ان کے ساتھ آئے ہیں۔ علیحدہ ایک کمرے میں رہتے ہیں کبھی کبھی اُن کے چیخنے چلانے کی آوازیں لوگوں نے سُنی ہیں۔

مرزا غضنفر بیگ صاحب اپنی کوٹھی کے نہایت آراستہ گول کمرے میں ایک مکلّف صوفے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کمرہ برقی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ اُن کی بڑی بڑی اور سفید مونچھیں اور چڑھی ہوئی ڈاڑھی اُن کے چہرہ کو بارعب بنا رہی ہے حالانکہ سب کے بال اُڑے ہوئے ہیں مگر باقی حصہ پر سفید بال نہایت سلیقہ سے بنے ہوئے ہیں چہرہ سے دُرشتی اور آنکھوں سے سنگدلی ٹپکتی ہے حالانکہ لبوں پر ایک خفیف تبسم ہے کئی بار گھڑی پر نظر جا چکی ہے۔ سورج غروب ہوئے تقریبًا ڈیڑھ گھنٹہ گذر چکا ہے۔ کوٹھی کے چاروں طرف سناٹا ہے۔ بہت دُور گیدڑوں کے بولنے کی آواز کبھی کبھی آجاتی ہے۔

مرزا غضنفر بیگ نو بجتے ہی صوفے سے اُٹھے اور بالاخانہ پر گئے۔ یہاں ایک طرف بہت لمبا برآمدہ ہے جس کے پیچھے برابر برابر کئی کمرے ہیں۔ ان کمروں میں سے اکثر مقفل ہیں اور جو کھلے ہیں اُن کی پشت پر کھڑکیاں ہیں جو باغ کی طرف کھلتی ہیں مگر ان میں حفاظت کے لئے بہت موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔

مرزا صاحب اِن کمروں کے سامنے سے گذرتے ہوئے ایک دروازے کے سامنے مُڑ کے۔ جیب سے کنجیاں نکال کر قفل کھولا اور کمرے کے باہر لگی ہوئی برقی گھنٹی بجائی۔ پانچ منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے ایک خادم کشتی میں کھانا لگائے ہوئے لایا اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا پیچھے پیچھے مرزا صاحب بھی اندر پہنچے۔ اِس کمرے میں صرف ایک پلنگ اور ایک کیلری تھی، پلنگ خالی تھا۔ مگر کرسی پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ مرزا صاحب اور

خادم کو دیکھ کر اُس نے بے معنی بکواس شروع کی۔ "یہ کیا کرتے ہو جی؟" میں پولیس میں خبر کر دوں گا۔ مجھے تین روز سے تم نے یہاں بند کر رکھا ہے۔ میں ہرگز یہ برتاؤ برداشت نہیں کر سکتا، یہ انگریزی راج ہے یا اندھیر، اگر پولیس کو خبر ہو گئی تو یاد رکھو تمھیں اپنی عزت سنبھالنی مشکل ہو جائے گی۔ آج تک مجھے ایسے بدمعاشوں سے واسطہ نہیں پڑا، صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے شریف ہیں اور کیوں جی یہ تمھارے آدمی مجھے بکس کے اندر بند کر کے یہاں لائے انہوں نے ایسی بے پرواہی سے بکس میں کیلیں جڑیں کہ ایک کیل میرے پاؤں کے اندر گھس گئی تمھیں معلوم نہیں ہے لوہے کا زہر خون میں اتر جائے تو آدمی مر جاتا ہے۔ اگر مجھے یہ زہر چڑھ جاتا تو پھر کیا ہوتا؟ تم تو اچھے خاصے رہتے میری جان جاتی، واہ یہ بھی کوئی انسانیت تھی۔ کیلیں احتیاط سے لگانے تو یہ کیوں ہوتا؟ اب تک درد ہو رہا ہے، یہاں تو میرے پاس کوئی دوا بھی نہیں ہے (کھڑا ہو جاتا ہے) بس مذاق ہو چکا اب مجھے گھر جانے دو، دیکھو میری بیوی اور بچی دونوں بہت سخت پریشان ہوں گے۔"

مرزا صاحب۔ "پروفیسر بوس! آپ ہرگز پریشان نہ ہوں، آپ کی بیوی آپ کے لئے ذرا بھی پریشان نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ تو آپ کو مرا ہوا سمجھ کر صبر کر چکیں۔"

ڈاکٹر بوس۔ "ہیں! مرا ہوا!! یہ کیا بکواس ہے؟ میں ایسا مذاق برداشت نہیں کر سکتا۔"

مرزا صاحب (اطمینان سے) "بھائی صاحب آپ کلوروفارم

کے اثر سے بہت کمزور ہو رہے ہیں۔ دماغ پر اتنا زور نہ ڈالیے"۔

ڈاکٹر بوس۔ "بھائی صاحب! بھائی صاحب!! یہ کیا؟ تم ہو کون؟"

مرزا صاحب۔ "خیر اس سے آپ کو کیا غرض کہ میں کون ہوں، اس وقت تو آپ میرے بڑے بھائی صاحب ہیں جو بارہ سال سے دیوانے ہیں میں آپ کا خود معالج ہوں، اس تنہائی کے مقام میں قیام کرنے کی وجہ یہی ہے کہ آپ کی دیوانگی سے شہر کے لوگوں کو بچانا مقصود ہے"۔

ڈاکٹر بوس۔ "یہ کیا باتیں ہیں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، میں پروفیسر بوس ہوں، تمھارا بھائی نہیں ہوں، اور نہ دیوانہ ہوں میں تو مشن کالج کا پروفیسر ہوں۔ تم مجھے بیوقوف بنانا چاہتے ہو"۔

مرزا صاحب۔ "خیر اب آپ مہربانی کر کے کھانا کھا لیجیے پھر میں آپ کو ایک جگہ لے جاؤں گا"۔ ڈاکٹر بچوں کی طرح رونے لگتا ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد۔ "اچھا کھانا کھالوں گا تو مجھے اس قید سے رہا کر دو گے؟"

"ضرور"

ڈاکٹر نے خاموشی سے کچھ کھانا کھایا۔ فارغ ہونے کے بعد نوکر برتن لے گیا اور مرزا غضنفر بیگ مع اپنے مہمان عزیز کے اس کمرے سے باہر نکلے اور کئی کمرے چھوڑ کر ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک بڑی میز کے گرد کئی کرسیاں پڑی تھیں اور میز پر کئی بوتلیں اور ایک برقی انگیٹھی رکھی تھی۔ مرزا نے پروفیسر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر کہا۔

"پروفیسر اتم نے جو نسخہ کیمیاتی ہیرے کا تیار کیا تھا، وہ تمھارے دست

کپتان عباس علی خاں بہادر نے بڑی مہربانی فرماکر مجھے عنایت فرما دیا ہے۔ میں نے اُس کے تمام اجزاء اور برقی انگیٹھی منگالی ہے۔ اب مہربانی کر کے مجھے ایک ہیرا تو بنا دیجئے۔ پھر آپ بالکل آزاد ہیں۔"

ڈاکٹر۔ (مسکراتے ہوئے) "جب تک وہ کرامت کی ڈبیا نہ ہو، ہیرا کیسے بن سکتا ہے؟"

مرزا (جیب سے ڈبیا نکالتے ہوئے) "یہ بات آپ کے دوست جناب رائے بہادر لالہ پرکاش نرائن صاحب نے مجھے پہلے ہی بتادی تھی اس لئے اُس روز جب کہ میں آپ کی خدمت والا میں بحیثیت ڈاکٹر آہنگر حاضر ہوا تھا تو سب سے پہلا کام جب کہ آپ تشریف بھی نہیں لائے تھے میں نے یہی کیا تھا کہ آپ کی دراز میں سے یہ ڈبیا نکال کر نہایت حفاظت سے اپنی جیب میں رکھ لی تھی، یہ حاضر ہے۔ ہیرا بنائیے۔"

ڈاکٹر۔ (غصہ سے کانپتے ہوئے) ڈاکو! دغاباز!! بے ایمان!!! ڈاکٹر آہنگر کے بھیس میں تو ہی آیا تھا۔ لیکن میں ہیرا بنانے کے لئے ہرگز تیار نہیں جاؤ کرلو کیا کرتے ہو۔"

مرزا۔ "میں اس کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ یہ لیجئے یہ ہے اس کا علاج۔" جیب میں سے ایک عجیب آلہ نکال کر ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑا، اور اس آلہ کے سوراخ میں اس کا انگوٹھا رکھ کر پینچ کسنا شروع کیا۔ ڈاکٹر شدتِ تکلیف سے بُری طرح بلبلا اُٹھا۔ مرزا نے پھر پینچ ڈھیلا کر دیا اور نہایت اطمینان سے کہا "اب تو دماغ درست ہے۔ ہیرا بناؤ گے؟"

ڈاکٹر۔ مار بھی ڈالو گے تو نہیں بناؤں گا! نہیں بناؤں گا!! ہرگز نہیں بناؤں گا!!!۔

مرزا مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور پھر ہاتھ پکڑ کر وہی عمل دُہرانا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر آنے والی تکلیف کے خیال سے کانپ اُٹھا اور اس کا استقلال قائم نہ رہ سکا۔ ”بناؤں گا، بناؤں گا، خدا کے لئے چھوڑ دو، بناؤں گا“۔

ظالم کنور سین ملقب بہ مرزا غضنفر بیگ کے ظلم سے مجبور ہو کر بیچارے ڈاکٹر بوس نے کیمیائی ہیرا بنانے پر آمادگی ظاہر کی۔ ادویات تول کر ڈبیا کے اندر بند کیں اور برقی بھٹی میں رکھ کر کرنٹ کھول دی اور دونوں ہیرا بننے کے انتظار میں اُس بھٹی سے کچھ فاصلہ پر بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر۔ ”خدا کے لئے یہ تو بتا دو تم کون ہو؟ اور آج صبح یہ جو تم نے اخبار میرے پاس بھیجا تھا جس میں میرے مرنے کی خبر شائع ہوئی تھی، اس سے کیا مطلب ہے؟ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں مر چکا ہوں، یا زندہ ہوں، خواب دیکھ رہا ہوں یا جاگتا ہوں، یہ کون سا مقام ہے، یہ دنیا ہی میں واقع ہے یا کسی بیابان پر؟ خدایا میں کیا کروں، جب میں زندہ تھا تو میں نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا۔ کبھی کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کیا، چوری نہیں کی، قتل نہیں کیا۔ پھر اگر یہ دوزخ ہے اور جو لوگ یہاں نظر آتے ہیں وہ عذاب کے فرشتے ہیں، تو یہ عذاب کس گناہ کی پاداش ہے؟ ہاں میں ضعیف الاعتقاد تو ضرور تھا۔ خدا کے وجود پر میں کبھی ایمان نہیں لایا، اپنی پچھلی زندگی کے متعلق آخری واقعات میں سے صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے کیمیائی ہیرا بنانے کا طریقہ ایجاد کیا۔ لالہ پرکاش نرائن سے

ایک مصنوعی ہیرے کی قیمت لگوائی، پھر ہیرا بنانے کا تجربہ پرکاش نرائن اور اُس کے بدبخت ساتھیوں کو دکھایا۔ اُنہوں نے مجھے اس تجربہ کا اعلان کرنے سے روکنا چاہا۔ میں نے انکار کیا۔ چند روز بعد میرے پاس ایک گمنام خط آیا جس میں مجھے قتل کی دھمکی دی گئی تھی۔ میں نے عباس علی سے مشورہ کیا۔ اُنہوں نے نسخہ مجھ سے لے کر اپنے پاس رکھ لیا اور مجھ کو پولیس میں اطلاع کرانے کا مشورہ دیا مگر اس روز ڈاکٹر آئنگر مجھ سے ملنے کے لئے آنے والا تھا۔.........

ہاں ٹھیک ٹھیک وہی تو شاید میرے مرنے کا دن تھا۔ گھر پہنچتے ہی مجھ سے مہری نے کہا کہ ڈاکٹر آئنگر دار العمل میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں اُس کمرے میں داخل ہوا۔ آئنگر نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ بس اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں....

(جیب سے اخبار نکال کر) مگر اس میں یہ کیا لکھا ہے کہ ڈاکٹر کسی آتش گیر مادے پر تجربہ کر رہے تھے، تجربہ ناکامیاب ہوا اور آتش گیر مادے میں آگ لگ جانے سے نہ صرف مکان کا یہ کمرہ بالکل منہدم ہو گیا بلکہ ڈاکٹر کا تمام جسم جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا اور اس تودۂ خاک سے سوائے ایک جوتے کے کچھ نہ برآمد ہوا.......

غلط غلط میں ہرگز نہ مانوں گا۔ نہیں میں ہرگز کسی آتش گیر مادے پر تجربہ نہیں کر رہا تھا یہ سب جھوٹ ہے، فریب ہے (ڈاکٹر از خود یہ باتیں کرتے کرتے کچھ اس طرح چونک پڑتا ہے جیسے ایک شخص پریشان خواب دیکھتے دیکھتے دفعتہً جاگ اُٹھتا ہے) او ظالم انسان! خدا کے لئے اب تو مجھے رہا کر دے، اب تو میں نے ہیرا بھی بنا دیا۔ اچھا تو بتاؤ تم مجھے یہاں لائے کیسے ؟"

کنور سین۔ "ڈاکٹر گھبراؤ نہیں، یہاں تو تم بڑے آرام سے ہو یہاں سے

جاکر کیا کرو گے؟ وہ لوگ جو تمھیں مرا ہوا سمجھتے ہیں، تمھیں بھوت سمجھ کر تم سے کوسوں دور بھاگیں گے۔ بیوی تو گھر میں گھسنے بھی نہ دے گی، یا خود گھر چھوڑ کر بھاگ جائیگی اور ابھی ہیرا بن تو جانے دو۔ لو میں تمھیں ایک مزے دار قصہ سُناتا ہوں۔"

"پروفیسر بوس جس نے کیمیائی ہیرا بنانے کا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ ایک دن اس مضمون کا تار وصول کرتا ہے، کہ ڈاکٹر آئنگر اُس سے مل کر کسی علمی مضمون پر بحث کرنا چاہتا ہے۔ بمقررہ وقت سے پہلے ڈاکٹر آئنگر مع ایک بہت بڑے صندوق کے پروفیسر کے مکان پر پہنچ کر صندوق پروفیسر کے دارالعمل میں رکھوا دیتا ہے جب پروفیسر اُس کمرے میں داخل ہوتا ہے تو اُس کا مخلص دوست ڈاکٹر آئنگر کلوروفارم سے اُس کی تواضع کرتا ہے، اور اُس کو بیہوش کر کے اُس کے کپڑے اُتار لیتا ہے، پھر بڑے صندوق سے انجمن جوہریان کے ایک رکن لالہ موہن لال صاحب کی نعش اُس میں سے نکال کر اُس نعش کو پروفیسر کے کپڑے پہنا کر اُس کی کرسی پر باندھ دیتا ہے۔ پھر بیہوش پروفیسر کو اُس بڑے صندوق میں بند کر دیتا ہے۔ اِس دَوران میں مصنوعی آئنگر برابر اس طرح گفتگو کرتا رہتا ہے کہ کمرے کے باہر اگر کوئی سُننے کی کوشش کرے تو یہی سمجھے کہ ڈاکٹر آئنگر اور پروفیسر بوس باتیں کر رہے ہیں۔ مُردہ موہن لال کو اِس طرح بٹھایا گیا تھا کہ جب دروازہ کھلے تو باہر سے دیکھنے والے کو صورت نظر نہ آئے اور کپڑوں سے وہ یہی قیاس کرے کہ پروفیسر ہی بیٹھا ہے۔ دروازہ کُھلا۔ پروفیسر کی مہری دروازے پر آ ئی۔ مگر بیہوش پروفیسر تو صندوق میں بند موٹر پر لد چکا تھا۔ جعلی آئنگر نے پروفیسر کی آواز میں مہری کو سمجھا دیا کہ میرے کمرے کے اندر کوئی نہ آئے، اور خود نہایت

صفائی سے موٹر میں بیٹھ کر چل دیا۔ مگر بارود اور دیگر آتش گیر مادوں کا کافی ذخیرہ کمرے کے اندر رکھ دیا گیا تھا، اور ایک گھڑی سُلگتا ہوا فتیلہ بھی لگا رکھا تھا جو ٹھیک آدھ گھنٹہ بعد بارود تک پہنچ گیا، اور تمام کمرہ اِس طرح بارود سے اُڑا کہ لاش کا پتہ نہ رہا اور ہر شخص نے یقین کر لیا کہ پروفیسر بوس آتش گیر مادے پر تجربہ کرتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔"

پروفیسر یہ ہولناک واقعات سُن کر صرف سسکیاں لے رہا تھا کہ دروازہ کے باہر سے کسی شخص نے کھٹکھٹایا۔ کنورسین نے خود اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ ایک طویل القامت سیاہ فام خادم کمرے میں داخل ہوا اور ادب سے سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مرزا صاحب نے بے چینی سے سوال کیا۔ "لے آئے؟"

ملازم۔ "حضور کی دعا سے شکار حاضر ہے حکم ہو تو پیش کیا جائے؟"

مرزا صاحب۔ "شاباش جے مل! آج تم نے انعام کے قابل کام کیا (جیب سے نوٹ نکالتے ہوئے) یہ دس روپے لو، مٹھائی کھانا۔" جے مل نے نوٹ لے کر سلام کیا اور اُلٹے پاؤں کمرے سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد گیلری میں کئی آدمیوں کے چلنے اور بھاری قدم پڑنے کی آواز آئی۔ کمرے کا دروازہ پھر کھلا، اور چار آدمی ایک لاش کو اٹھائے اندر داخل ہوئے اور لاش زمین پر رکھ دی۔ کنورسین کے حکم سے اُس کا مُنہ کنورسین کی کرسی کی طرف پھیر دیا گیا۔ یہ چاروں آدمی اور پانچواں جے مل دیوار کے قریب ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ کنورسین نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا ڈاکٹر نے لاش کی طرف دیکھا اور دفعتہً چیخ اُٹھا۔ "ہیں! عباس علی خاں! کیا تم نے

اسے مار ڈالا؟" کنور سین نے زور سے ہاتھ پکڑ کر ڈاکٹر کو پھر کرسی پر بٹھا دیا اور
جے مل کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "جے مل! دیکھا تم نے میری مخالفت کا نتیجہ
اور میرے انتقام کا جوش؟ بیچارہ عباس علی تو ایک معمولی درجے کا انسان ہے
میں تو وہ طاقت رکھتا ہوں کہ عظیم الشان سلطنتوں کا تختہ الٹ دوں، اور بڑے
بڑے باجبروت بادشاہوں کو دم بھر میں ذلیل و خوار کر کے گدا بنا دوں، مگر جے مل
یہ آدمی خطرناک ہے، اس سے بے خبر نہ ہونا۔ ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھ دو، اور دو
مضبوط آدمی پہرے پر تعینات کرو۔ اس کے زخم کی مرہم پٹی تو کروا دی ہوگی؟
اس کمبخت نے کئی بار مجھے اپنی طفلانہ حرکات سے پریشان کیا ہے۔ میں ہرگز نہیں
چاہتا کہ یہ ایسی آسانی سے مر جائے میں تو اس کو تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا ہوں، جاؤ
اس کو لے جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے کنور سین نے نہایت تذلیل سے بظاہر بیہوش مگر
درحقیقت ہوشیار عباس علی کے منہ میں آہستہ سے ٹھوکر لگائی۔ "دیکھو رسی لاکر
اس کے ہاتھ پیر میرے سامنے باندھو، پھر یہاں سے لے جانا۔" ایک آدمی رسی
لینے کے لئے چلا گیا، باقی اسی طرح کھڑے رہے۔ کپتان کو جس وقت تک اس
کمرے میں لے کر آئے ہیں، ہوش نہ تھا لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلے
کان میں کچھ آوازیں آئیں اور آنکھیں کھولنے سے قبل اس کا حیرت انگیز دماغ
کام کرنے لگا۔ اس نے کنور سین اور جے مل کے درمیان گفتگو سن کر اس کا مطلب
سمجھ لیا اور اس کو ایک خطرناک مقام میں ہونے کا احساس بھی پوری طرح ہو گیا
اس نے پوری طرح آنکھیں کھولنا مناسب نہ سمجھا، اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ
اپنا ہوش میں آنا اپنے دشمنوں سے چھپایا، اور بہت احتیاط سے اس نے

کنور سین اور ڈاکٹر بوس کو دیکھ لیا۔ ڈاکٹر بوس کو زندہ دیکھ کر اُسے کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا، کیونکہ شروع ہی سے اُس کو ڈاکٹر کی موت میں شبہ تھا۔ اُس نے شروع سے آخر تک تمام واقعات کو پیش نظر رکھ کر حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہو گیا۔ اب صرف یہ فکر باقی رہا کہ کہیں ڈاکٹر نے کیمیائی ہیرے کا راز اس بدمعاش کو نہ بتا دیا ہو، اور اگر نہ بتایا ہو تو کم از کم اُس وقت تک جب کہ رہائی کا موقع ملے ڈاکٹر کے استقلال میں تزلزل نہ پیدا ہو تھوڑی دیر میں رسّی آ گئی۔ ہاتھ پیر خوب کس کر باندھے گئے۔ کنور سین نے خود بندشوں کا معائنہ کیا اور ملازمین عباس علی خاں کو اٹھا کر اُس کمرے سے باہر لے گئے کنور سین اور ڈاکٹر بوس پھر اس کمرے میں تنہا رہ گئے۔ اب انگیٹھی کو جلتے ہوئے تین گھنٹے گذر چکے تھے لہٰذا کرنٹ بند کر دی گئی۔ انگیٹھی کے ٹھنڈا ہونے میں دو گھنٹے کا انتظار اور تھا، یہ وقت بھی کسی نہ کسی طرح گذرا۔ ایک بجنے کے بعد انگیٹھی میں سے ڈبیا نکال لی گئی۔ چونکہ مزید انتظار کنور سین کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس لئے ایک زنبورے ڈبیا کھولی گئی۔ اُس کے اندر سے ایک سیاہ ڈلا برآمد ہوا کنور سین نے غصہ سے بے چین ہو کر کہا۔ "یہ کیا ہے؟" ڈاکٹر نے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا "یہی تو ہیرا ہے۔ صبح تک انتظار کیجئے پھر کسی ہیرا تراشنے والے کو بلا کر اسے کٹوائیے، اس کے اندر سے ہیرا نکلے گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے، مگر شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ میں خود ہیرے کا تراشنا اور پرکھنا جانتا ہوں، اور اوزار بھی یہیں موجود ہیں، میں اس کو ابھی تراش کر دیکھتا ہوں، اگر ذرا بھی دھوکے کا شبہ مجھے ہوا تو یاد رکھو پھر اس بھٹی کو روشن

کر کے تمھارا سر اس کے اندر ٹھونس دوں گا۔"

ڈاکٹر اس دھمکی سے کانپ اُٹھا۔ "نہیں جناب اپنی طرف سے تو میں نے دھوکا کیا نہیں، لیکن ہیرا نہ بنے تو میرا کیا قصور؟ ممکن ہے دوائیں ٹھیک نہ ہوں۔ میرے ہوش و حواس بالکل معطل ہیں، شاید اوزان میں فرق رہ گیا ہو اور اس لئے فرق رہ جائے۔"

کنور سین۔ "جی ہاں اگر یہ سب باتیں ممکن ہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی بوڑھی کھوپڑی میں برمے سے دو سوراخ کر کے اُس میں تھوڑا سا گرم تیل ڈال دیا جائے۔"

"خدا کے لئے ایسی خوفناک باتیں میرے سامنے نہ کہو، میں بالکل دیوانہ ہو جاؤں گا۔"

کنور سین نے ایک قہقہہ لگایا لیکن قہقہہ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ دفعتہً زور سے دروازہ کھُلا اور عباس علی عجیب ہیئتِ کذائی میں کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اُس کے بال پریشان تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ پر دیوانگی، وحشت برس رہی تھی۔ قمیص کا گریبان اوپر سے نیچے تک پھٹا ہوا تھا۔ خود اُس کا چہرہ ہاتھ اور قمیص کا دامن خون میں لت پت تھا، اور ہاتھ میں ایک لمبا لوہے کا ٹکڑا تھا۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی ڈاکٹر کی جو کیفیت ہوئی بیان نہیں کی جا سکتی۔ مگر کنور سین کی بھی روح فنا ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُٹھ کر کمرے سے باہر بھاگ جائے، مگر کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور دروازہ میں خونخوار عباس علی کھڑا تھا تاہم وہ بھاگ کر ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ عباس علی نے

زور زور سے چیخنا شروع کیا۔ "جے بھگوان! دم مدار!! وہ چھوٹا گولا گڑھے میں پانی بھر گیا، چوہا بل میں گھس گیا، ارے یہ بوڑھا سا دھوکون بیٹھا ہے؟" یہ کہتا ہوا آگے بڑھا، اور ڈاکٹر کے پاس آکر آنکھوں سے آنکھیں ملا کر اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اُس کا سر سہلایا، کمر تھپکی، ہاتھ چومے۔ غریب ڈاکٹر کی گھگی بندھی ہوئی تھی، کنور سین کو یقین ہو گیا کہ پشت سر پر کاری زخم لگنے سے عباس علی دیوانہ ہو گیا ہے۔ اُس کو ڈاکٹر کے ساتھ مشغول پاکر کنور سین بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر لیا۔ گیلری میں ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ اُس کو سات آٹھ آدمی ملے جو رسیاں لئے ہوئے بھاگے آرہے تھے کنور سین نے پوچھا۔ "یہ کیسے چھوٹا؟ محافظ کہاں مر گئے تھے؟"

"حضور دو آدمی پہرے پر لگائے گئے تھے اُس کو بیہوش اور بندھا ہوا سمجھ کر ایک آدمی روٹی کھانے باہر چلا گیا دوسرا شاید اونگھنے لگا جب وہ آدمی کھانا کھا کر آیا تو معلوم ہوا کہ قیدی غائب ہے اور جو پہرہ دار اس کمرے میں تھا مرا پڑا ہے۔"

"اچھا جو مر گیا اُس کو سزا مل گئی، جو کمرہ چھوڑ کر کھانا کھانے گیا تھا اُس کو حوالات میں بند کر دو، کل معقول سزا دی جائے گی اور قیدی کو پکڑنے کے لئے پانچ چھ آدمی اور بلاؤ، کیونکہ قیدی دیوانہ ہو گیا ہے، اور خونخوار ہے۔"

کنور سین بارہ آدمیوں کی فوج لے کر پھر کمرے میں داخل ہوا، ادھر عباس علی کو جو صرف بنا ہوا دیوانہ تھا بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے ڈاکٹر کو اطمینان دلایا کہ وہ اُس کی مدد کے لئے آگیا ہے اور بہت جلد اُس کو اس قید

اور مصیبت سے نجات دلائے گا۔ اُس نے ڈاکٹر سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ کم از کم کل دوپہر تک وہ ہیرا بنانے کا راز محفوظ رکھے گا۔

~~~~~~~~~~~~~

جب کنور سین عباس علی کو گرفتار کرا کر کمرے سے باہر بھیج چکا تو اب پھر ہیرے کا فکر ہوا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے جیب سے کچھ اوزار نکالے، اور نہایت اطمینان سے بیٹھ کر ہیرا تراشنا شروع کیا، مگر فوراً ہی ظاہر ہو گیا کہ اس سیاہ وزنی ڈلی میں سے جو ڈبیا سے نکلی تھی، بجز راکھ کے کچھ نہ تھا۔ کنور سین نے جھلا کر ٹکڑوں اور راکھ کو میز پر پھینکا اور غصہ سے بوڑھے پروفیسر کا گلا دبانا شروع کیا، قریب تھا کہ دم نکل جاتا مگر کچھ سوچ کر کنور سین نے اُس کو چھوڑ دیا اور نہایت درشت لہجہ میں پوچھا۔ "بتاؤ یہ ہیرا کیوں نہیں بنا؟"

"میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میرے ہوش و حواس درست نہیں، ممکن ہے اوزان میں غلطی رہ گئی ہو، صبح تک مجھے اور مہلت دو، کل میں ہیرا ضرور بنا دوں گا۔"

"خیر میں تمھیں ایک موقع اور دیتا ہوں، اگر اس دفعہ بھی ناکامیابی ہوئی تو یاد رکھو کہ بری طرح تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔"

× ×

۷۔ رہائی

عباس علی خاں کی کوٹھی واقع دریا گنج میں آج صبح سے کئی آدمیوں کا مجمع ہے
~~~~~~~~~~~~~

عباس علی کے چاروں رفقاء علی شیر، راجپال سنگھ، پورن سنگھ اور نواب زادہ رحمت علی خان اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ غور وخوض بحث و مباحثہ کے بعد کسی ایسی تدبیر پر عمل کرنے کا پروگرام بنائیں جس سے اُن کے عزیز اور گم شدہ دوست کا سُراغ چل سکے۔ اس سے قبل بارہا ایسا اتفاق ہوا تھا کہ انہی لوگوں نے کپتان کی موجودگی میں اور اُس کی مدد سے نہایت مشکل اور پُراسرار واقعات کا سُراغ لگایا تھا۔ لیکن کپتان کی غیر موجودگی میں یہ چاروں دوست گویا ایک ایسے جسم کے ہاتھ پیر تھے جس کا سر کٹ کر جدا ہو گیا ہو، یا ایک ایسی مشین کے پُرزے تھے جس کا انجن چوری گیا ہو۔ مسلسل دو گھنٹے بحث کرنے اور کئی درجن توس اور کئی سیر چاء کا پانی ختم کرنے کے باوجود وہ اس نظریہ سے آگے نہ بڑھتے تھے کہ کپتان عباس علی خاں کسی چوہے کے بل میں گھس گئے ہیں۔ اگرچہ اُن میں سے ایک صاحب تعلیم یافتہ رئیس، دوسرے وکیل، تیسرے ایک جوہری کے سکرٹری اور چوتھے گریجویٹ امید وار ملازمت تھے۔ مگر مجبوراً سب اپنی اپنی عقلوں کا ماتم کر رہے تھے اور رہ رہ کر عباس علی کی سمجھ بوجھ کو بار بار یاد کر کے بے قرار ہو رہے تھے آخر کار اُنہوں نے ایک نہایت بھدی سکیم تیار کی کہ آج ہی چاروں آدمی شہر کو چار حصوں پر تقسیم کر کے اپنے اپنے حصوں میں تلاش شروع کریں اور روز صبح کو یہیں جمع ہو کر اپنی اپنی جستجو کے نتائج بیان کریں۔ نواب زادہ رحمت علی خاں کو مشرقی علاقہ دیا گیا جس میں دریائے جمنا اور اُس کے دونوں کنارے بھی شامل تھے۔ اس انتخاب کی ایک خاص وجہ تھی، نواب صاحب نے حال ہی میں ایک سٹیم بوٹ خریدی تھی اور روز شام کو سیر کے لئے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ

شام کا وقت اسی کام کے لئے وقف کر دیا گیا۔ دن بھر خشکی پر تلاش کی جائے گی اور شام کو چار گھنٹے دریا کی موجوں پر۔

نشیمنِ عقاب میں صبح ہوتے ہی ایک نئی امید کی لہر کنور سین کے دل میں دوڑی۔ بستر سے اُٹھتے ہی اُس نے غور کرنا شروع کیا کہ آج یقیناً پروفیسر کیمیائی ہیرا بنا کر دکھا دے گا، اور پھر میں نیپال کی ترائی میں سام نگر کے جنگل کے وسط میں جس ویران قلعہ پر میرا قبضہ ہے، وہاں پروفیسر کو قید رکھوں گا اور وقتاً فوقتاً اُس سے ہیرے بنواتا رہوں گا۔ لالہ پرکاش نرائن بھی کیسے احمق واقع ہوئے ہیں وہ اپنے دل میں سمجھ رہے ہوں گے کہ میں بہت بڑی تعداد میں ہیرے بنوا کر اُنہیں کوڑیوں کے مول بیچا کروں گا۔ ہرگز نہیں، یہ تو خود میرے مفاد کے خلاف ہے میں اپنے ہیرے اِس ہوشیاری سے فروخت کروں گا کہ دنیا کی منڈیوں میں ہیرے کا بھاؤ گرنے نہ پائے۔ دو تین برس میں آٹھ دس ارب روپے کے ہیرے بیچ لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ دنیا کا وہ کون سا بڑا شہر ہے جہاں میرے تعلقات قائم نہیں اور اگر تعلقات نہ بھی ہوں تو قائم کر لینا کون سی دشوار گذار مہم ہے۔

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، کنور سین نے سُلگتے ہوئے سگار کا ایک لمبا کش لے کر سگار ایش ٹرے پر رکھا اور کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا آسمان پر پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں درختوں کے دُھلے دُھلائے پتّوں کی سبزی آنکھوں میں گھبی جاتی تھی۔ کنور سین کا دل

برسات کی کیفیت کو دیکھ کر وجد کرنے لگا اور اس مستی کے عالم میں اُسے کپتان کا خیال آیا اور نہایت خوش ہو کر اُس نے سوچا کہ آج ایسے سخت دشمن سے بدترین انتقام لینے کا بہترین موقع ہے۔ وہ مسکراتا ہوا انگڑائی لے کر کھڑا ہو گیا اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ دروازے پر وہ ایک خادم کو ناشتہ کی کشتی لئے ہوئے دیکھنے کا متوقع تھا مگر دروازہ کھولتے ہی اُسے ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ کپتان عباس علی خاں صابن کا بے شمار جھاگ منہ اور سر اور ہاتھوں پر لپیٹے ہوئے بڑے زور سے ھُنکار مار رہے تھے۔ کنور سین کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ چاروں طرف نہایت بے بسی کے عالم میں بھاگ جانے کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا مگر کمرے کا ایک ہی دروازہ تھا اور اُس دروازے کا تین چوتھائی رقبہ کپتان کے دیوپیکر جسم نے گھیر رکھا تھا۔ کنور سین نے سوچا کہ اس وقت اس دیوانہ کو کسی تدبیر سے بہلانا چاہئے۔ اِس لئے اُس نے عباس علی سے بہت مہربانی کے ساتھ گفتگو کی اور آخر اُس کو اس بات پر راضی کر لیا کہ اس کمرے سے باہر نکل کر کھانے کے کمرے میں جائیں اور وہاں ناشتہ کریں۔ چنانچہ کپتان آگے آگے اور کنور سین پیچھے پیچھے چلے۔ کئی کمروں سے گذر کر اس کمرے کے سامنے پہنچے جس میں پروفیسر مقید تھا اور جس کے تالے کی کنجی خود کنور سین کے پاس تھی مگر یہ دیکھ کر کنور سین کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کمرے کا مضبوط دروازہ بالکل کھلا ہوا ہے اور پروفیسر چھت میں ایک رسی سے اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ اپنے کمرے سے نکلتے ہی کنور سین برقی گھنٹی کا بٹن دبا چکا تھا، اِس لئے پندرہ سولہ مضبوط جوان رسیاں لئے ہوئے آ پہنچے اور کپتان کو جکڑ لیا۔ چند آدمیوں نے کنور سین کے حکم سے پروفیسر

کو اس ناخوش گوار ورزش سے جس میں وہ مبتلا تھے، نجات دلائی۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کے ہوش وحواس درست نہیں، ہوش میں لانے کی تمام تدابیر عمل میں لائی گئیں مگر کوئی کارگر نہ ہوئی۔

تحقیقات کرنے پر کنورسین کو معلوم ہوا کہ دو پہرے دار جو کپتان کی حفاظت کے لئے مقرر کئے گئے تھے صبح کے وقت اسی کمرے میں مردہ پڑے ہوئے ملے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلا گھونٹ کر دونوں مارے گئے ہیں۔ یہ معلوم ہو کر کنورسین کو سخت پریشانی ہوئی پہلے تو یہ خیال ہوا کہ ایسے خطرناک آدمی کو فوراً مار ڈالنا چاہیئے۔ لیکن جب اُس کو وہ واقعات یاد آئے جن کے ظہور پذیر ہونے سے گذشتہ ایام میں کپتان نے کنورسین کی بڑی بڑی تجاویز کو خاک میں ملا دیا تھا تو اُس کا جذبہ انتقام بھڑک اٹھا اور اُس کی شیطانی خصلت اپنی کریہہ ترین صورت میں ظاہر ہوئی۔ اُس نے غصہ سے بیتاب ہو کر یہ قطعی فیصلہ کیا کہ آج ہی اُس کو اور پروفیسر بوس کو نیپال کی سرحد میں سام نگر والی گڑھی میں بھیج دے۔

شام کو چار بجے کے قریب ڈاکٹر کو ہوش آیا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی دیوانہ ہو گیا۔ اس نئی تبدیلی نے کنورسین کی صبح والی تجویز میں تقویت پیدا کر دی انتظام ہو چکا تھا۔ ایک سیلون کار میں دونوں کو ہاتھ پیر باندھ کر اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر بٹھایا گیا۔ علاوہ ڈرائیور کے تین مضبوط آدمی حفاظت کے لئے اندر بٹھائے گئے، موٹر روانہ ہوئی اور کچے راستوں سے گذرتی ہوئی تقریباً چھ بجے جمنا کے کنارے پہنچ گئی۔ یہ مقام بالکل سنسان تھا صرف ایک دُخانی کشتی پہلے سے اِس موٹر کا انتظار کر رہی تھی اور دو مضبوط کہار ایک بڑی ڈولی لئے

ہوئے کھڑے تھے۔ دونوں قیدیوں کو یکے بعد دیگرے کشتی میں سوار کر دیا گیا، اور
تینوں محافظ بھی کشتی میں سوار ہو گئے۔ دس منٹ کے بعد ایک موٹر میں کنور سین
بھی آ پہنچا اور کشتی میں سوار ہو گیا۔ اس کشتی کے اوپر تین کمرے تھے ایک کمرہ آگے کی
طرف تھا جس میں کنور سین کے لئے سونے اور بیٹھنے کا انتظام تھا۔ یہ سب سے بڑا
کمرہ تھا، اس کے پیچھے اور کشتی کے وسط میں چھوٹا سا انجن تھا اور خلاصیوں کے
رہنے کی جگہ تھی۔ پشت کی طرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے ان میں سے ایک
میں دو بینچ بالمقابل لگے ہوئے تھے۔ ان بینچوں پر دونوں قیدی باندھ دیئے
گئے اور کشتی روانہ ہو گئی۔ کپتان کچھ دیر تک خاموش لیٹا رہا، اور اس مایوسی کی حالت
میں رہائی کی تدابیر پر غور کرتا رہا۔ بظاہر کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی اور رہائی محال نظر
آتی تھی۔ کئی بار اُس نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کی بندشوں کو آزمایا لیکن اس قدر
مضبوط رسیاں بندھی ہوئی تھیں کہ ان کا کھولنا یا توڑنا قطعی ناممکن تھا۔ مگر خوش قسمتی
سے ڈاکٹر کو کمزور سمجھ کر اُس کے ہاتھوں کو صرف آگے کی طرف باندھا گیا تھا اور بندش
زیادہ سخت نہ تھی۔ کپتان نے پروفیسر کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا کہ ہوشیار ہو جاؤ
اور اپنی اُنگلیوں سے میرے مُنہ کا کپڑا نکال لو۔ ڈاکٹر نے ڈرتے ڈرتے کپتان کے
مُنہ سے کپڑا کھینچ لیا، مگر ڈھاٹا پھر کھینچ کر لپیٹ دیا۔ کپتان نے پھر اُس کی طرف
جُھک کر آہستہ سے کہا "میری قمیص کی جیب میں ایک سیفٹی ریزر کا بلیڈ پڑا ہوا ہے
اس کو نکال کر میرے ہاتھ کی رسی کاٹ دو۔" ڈاکٹر نے بلیڈ تو نکال لیا لیکن اُس
کے کمزور بندھے ہوئے ہاتھ رسی کو کاٹنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کپتان کو سخت
غصہ آیا۔ اُس نے جھٹ اپنے دانتوں سے وہ گرہ کھول ڈالی جس سے ڈاکٹر کے

ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھ کھُلنے کے بعد ڈاکٹر نے آسانی سے کپتان کے ہاتھ کی رسّی کاٹ ڈالی۔ ٹھیک اس وقت کمرے کے باہر کچھ آہٹ معلوم ہوئی۔ کپتان نے جلدی سے ڈاکٹر کے ہاتھ پر پھر رسّی لپیٹ کر گرہ لگا دی، اپنے مُنہ میں رومال ٹھونس لیا اور اپنے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کر کے چت لیٹ گیا، اور طرح طرح کے مُنہ بنانے لگا جن کو دیکھ کر کمرے میں آنے والا خادم بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا پھر اُس نے ایک غائر نظر سے دونوں قیدیوں کو دیکھ کر پوری طرح اطمینان کر لیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کپتان نے اپنے قریب کی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا دن ختم ہو رہا تھا۔ آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی، ہوا تیز چل رہی تھی اور برسات کی وجہ سے جمنا کا پاٹ اس مقام پر میل بھر سے کم نہ تھا۔ موجیں اُٹھ رہی تھیں مگر دُخانی کشتی نہایت بے پرواہی کے ساتھ سینۂ آب کو چیرتی چلی جا رہی تھی۔ دریا کے دونوں کنارے کشتی سے اتنی دُور تھے کہ اگر کوئی پوری طاقت سے چیخے تو کناروں تک آواز نہ جا سکتی تھی۔ اگر کپتان قید سے رہائی حاصل کرنا چاہتا تو دریا میں کود کر اور غوطہ لگا کر کہیں سے کہیں پہنچ سکتا تھا لیکن پروفیسر کو اِس حالت میں چھوڑ کر جانا کپتان کو ہرگز منظور نہ تھا اور پروفیسر کو ساتھ لے کر بھاگ نکلنا دشوار کیا قطعاً ناممکن تھا۔ اِدھر دہلی سے فاصلہ جُوں جُوں زیادہ ہوتا جاتا تھا، یہ اندیشہ بڑھ رہا تھا کہ آئندہ خدا جانے کیا صورتِ حال پیش آئے۔ اِن کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیچ دھار کو چھوڑ کر مغربی کنارے کے قریب قریب جا رہی ہے۔ جب یہ کشتی تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر آئی تو کپتان نے اس کو اپنی طرف بلانے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر کے بعد

وہ موٹر بوٹ اپنا رُخ بدل کر بیچ دھار کی طرف آنے لگی۔ مگر غالباً کنور سین نے بھی اس موٹر بوٹ کو دیکھ لیا اور دخانی کشتی کی رفتار تیز کر دی گئی اور بہت جلد موٹر بوٹ سے اِس قدر نزدیک ہو گئی کہ کپتان نے اس موٹر بوٹ کو پہچان لیا۔ اِسی دَوران میں کپتان اپنے پیروں کی رسیاں بھی کاٹ چکا تھا۔ اُس نے نہایت تیزی کے ساتھ پہلے تو موٹر بوٹ کی طرف سگنل شروع کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موٹر بوٹ میں کوئی شخص ان اِشاروں کو خوب سمجھ رہا تھا، کیونکہ موٹر بوٹ تیزی کے ساتھ دُخانی کشتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کپتان نے جلدی سے ڈاکٹر کو گود میں اُٹھایا اور چاہتا تھا کہ کھڑکی سے باہر پھینک دے، مگر ڈاکٹر نے خوف سے چیخ ماری، کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک قوی ہیکل آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ کپتان نے ڈاکٹر کو باہر پھینک ہی دیا مگر خود کودنے کا وقت نکل چکا تھا۔ کیونکہ اُس آدمی نے پیچھے سے کپتان کی گردن پکڑ لی تھی۔ کپتان نے پیچھے مڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ گردن اُس آدمی کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اُس کو ابھی ہوش نہ آیا تھا کہ کپتان نے ایک مُکّا اِس زور سے اُس کے کان پر مارا کہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ کپتان کھڑکی سے باہر کود رہا تھا کہ تین آدمی کمرہ میں اور داخل ہوئے۔ اِس دفعہ کپتان اُن کے قریب آنے سے پہلے ہی کشتی سے نیچے کود گیا۔ اب موٹر بوٹ بالکل برابر آ گئی تھی اور اُس کا مالک کنور سین سے چلا کر پوچھ رہا تھا۔ "آپ کے یہ دونوں آدمی کیسے گر گئے؟"

کنور سین ۔ اِن میں سے ایک دیوانہ تھا اور دوسرا بیمار، دیوانے نے بیمار کی بھی جان لی۔" کنور سین نے یہ کہہ کر بڑے غور سے تمام جو موٹر بوٹ کو جو چاروں طرف سے کھُلی ہوئی تھی دیکھا۔ اپنی کشتی کی رفتار فوراً دھیمی کرا دی مگر

موٹر بوٹ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ کنور سین نے چاروں طرف آدمی مقرر کئے لیکن گرنے والوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اِدھر موٹر بوٹ جب تقریباً ایک میل نکل گئی تو موٹر بوٹ کے مغربی کنارے سے دو سر بلند ہوئے۔ موٹر بوٹ کے آدمیوں نے اِن دونوں کو اُوپر کھینچ لیا۔ اِن میں سے ایک تو تقریباً مردہ معلوم ہوتا تھا اور دوسرا ابھی اس قدر تھکا ہوا تھا کہ ایک آرام کرسی پر گر پڑا اور موٹر بوٹ کے نوجوان مالک سے جو پاس ہی کھڑا مسکرا رہا تھا کہنے لگا "رحمت علی! اس وقت تم بڑے موقع سے پہنچے"۔

"بھئی کپتان! کیا تم نے بھی کمال، یعنی آپ مرنے کے لئے دریا میں کود پڑے تھے، اور اگر وہ دیکھ لیتا اور فوراً فائر کر دیتا تو کیسی ہوتی؟"

کپتان۔ ہنستے ہوئے "میں اِن سب باتوں پر غور کر چکا تھا۔ اوّل تو تمھاری موجودگی میں کنور سین جیسوں کا فائر کرنا محال تھا اور اگر کرتا اور ہم نشانہ بن جاتے تو خیر خدا کی مرضی۔ لے دے کر ہماری رہائی کا یہی تو ایک موقع تھا"۔

نواب زادہ رحمت علی خاں۔ "کیا یہ شخص کنور سین تھا؟ میاں تمھیں تو ہمیشہ کنور سین ہی کے خواب آتے رہتے ہیں"۔

کپتان۔ "کیا تمھیں یقین نہیں آتا؟ اس شخص نے خود کنور سین ہونے کا اقبال کیا۔ ہیں ہیں یہ آواز کیسی؟" سب کی نظر اُس طرف گئی جدھر دخانی کشتی جا رہی تھی اُفق کے قریب ایک شرارہ نظر آیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ دخانی کشتی کا بائلر پھٹ گیا۔ دھماکہ اِس زور کا ہوا ہے کہ کشتی یقیناً پاش پاش ہو گئی ہو گی۔ اچھا ہوا کمبخت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوا"۔

کپتان۔ "بھئی رحمت علی! تم کنور سین کو ہرگز نہیں سمجھتے۔ یقیناً اس میں کوئی چال ہے"۔

۸۔ فرار

نینی تال کے ایلیسیم ہوٹل کی دوسری منزل پر ایک خوش نُما اور آراستہ کمرے میں ایک بیگم مع اپنی صاحبزادی کے ٹھیرے ہوئے ہیں۔ صبح کا وقت ہے، تقریباً آٹھ بجے ہیں۔ کمرے کی پشت پر ایک نہایت کشادہ کھڑکی ہے۔ اُس کے باہر منظر کس قدر دل آویز ہے۔ نکھرا ہوا نیلگوں آسمان ایک شامیانہ کی طرح اوپر پھیلا ہوا ہے، اور نیچے ایک قدرتی جھیل کا شفاف پانی چاروں طرف سرسبز پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اِن پہاڑیوں سے پرے بہت دُور شوالک کی برفانی چوٹیاں سورج کی روشنی میں کھڑی نہا رہی ہیں۔ ہوا اس قدر آہستہ آہستہ چل رہی ہے کہ جھیل کا پانی آئینہ بنا ہوا ہے جس میں اِرد گرد کی پہاڑیوں اور اُن کی ہریالی کا انعکاس ایک شاعر یا تخیل پرست انسان کے دل کو تڑپا دینے والا ہے۔ کمرے کے اندر بھی فضا نہایت پُرسکون ہے۔ کمرے کے وسط میں ایک گول میز کے قریب ایک گدّے دار سوفے پر نواب نصیر الدین بیٹھے کسی فقہ کی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اِن کی سفید لمبی ڈاڑھی اور سُرخ و سفید نورانی چہرے کو دیکھ کر ہر شخص اُن کے فرشتہ خصلت ہونے کی گواہی دے سکتا ہے۔ آنکھوں پر عینک لگی ہوئی ہے، لبوں پر ایک پُرسکون اور باوقار تبسّم ہے، گویا آپ رحم و کرم

عفو و بخشش کی مجسم تصویر ہیں۔ نواب صاحب کی پشت کی طرف اُن کی صاحبزادی انگریزی لباس میں ملبوس تیلیاں اور اُون کا گولا لئے جراب بُن رہی ہیں۔ کسی نے باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھلا اور ایک خادم اندر داخل ہوا۔ نواب صاحب نے بغیر کتاب پر سے نظر ہٹائے ہوئے صاحبزادی کو مخاطب کرکے کہنا شروع کیا۔ "بٹیا! راجپوتانہ کے مفلوک الحال اور فاقہ کش مسلمانوں کے لئے اِس وقت تک کتنا چندہ جمع ہو چکا ہے؟"

"بابا! آپ نے اور میں نے چندہ جمع کرنے میں دو مہینے کامل صرف کئے مگر سوائے اُس ایک ہزار کی رقم کے جو آپ نے اپنے پاس سے شروع ہی میں بھیج دی تھی اور کوئی بڑی رقم اب تک نہیں آئی۔"

نواب صاحب نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور آہِ سرد بھر کر کہا "جانِ بابا! ہماری تو اگر کھال بھی مسلمانوں کے کام آسکے تو ہمیں اُس سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیئے۔" خادم کچھ دیر سے ایک چھوٹی سی چاندی کی کشتی پر ایک کارڈ رکھے ہوئے کھڑا تھا۔ نواب صاحب نے بات پوری کرکے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی عینک ناک سے پیشانی کی طرف سرکائی۔ نہایت متانت سے خادم کے چہرے کا مطالعہ کیا اور کشتی سے کارڈ اٹھا کر آہستہ آہستہ رُک رُک کر پڑھنا شروع کیا "لالہ پرکاش نرائن، صدر انجمن جوہریان، دہلی" پڑھ کر نواب صاحب کچھ اِس طرح سوچنے لگے جیسے یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ لالہ پرکاش نرائن سے کب کی واقفیت ہے اور وہ کیوں ملنے کے لئے آئے ہیں؟ پھر کہنے لگے "کیوں بٹیا! تم نے کچھ زیور خریدنے کے لئے اِن کو بلایا ہے؟"

"نہیں بابا! بغیر آپ کی اجازت کے میں ایسا کیوں کرتی؟ مگر خیر بلا لیجئے شاید کسی کام سے آئے ہوں!"

نواب صاحب نوکر سے۔ "اچھا بھئی بلا لو۔ لوگ خدا معلوم مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں؟ جتنا میں دنیا کو ترک کرنا چاہتا ہوں اُتنا ہی دنیا میرے پیچھے پڑتی ہے"

نوکر واپس چلا گیا، مگر صاحبزادی نے پوچھا۔ "کیا بابا میں دوسرے کمرے میں چلی جاؤں؟"

"نہیں بیٹا اِس کی کیا ضرورت ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں پردے کا ہمیشہ سے مخالف ہوں اور جس قدر میرا مذہبی کتابوں کا مطالعہ وسیع ہوتا جاتا ہے اُسی قدر میرا یقین پختہ ہوتا جاتا ہے کہ ہمارے پاک مذہب نے عورتوں کو پردہ کرنے کا حکم ہرگز نہیں دیا........!"

رائے بہادر لالہ پرکاش نرائن کمرے میں داخل ہوئے اور احتیاط سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ نواب صاحب نے سوفے سے اُٹھ کر مصافحہ کیا اور سامنے والی کُرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھ گئے۔ لالہ صاحب نے بڑے غور سے نواب صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اگر سردار سادھو سنگھ صاحب نے مجھے اس بات کا یقین نہ دلایا ہوتا کہ آپ کا نیا نام بلکہ نیا جنم نواب نصیر الدین خاں ہے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ کو ہرگز نہ پہچان سکتا میں صرف اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ نے جو دس لاکھ کی رقم ہماری انجمن سے وصول کی ہے اُس میں ہمارے ساتھ سخت دھوکا کیا گیا۔ آپ نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ کیمیائی ہیرے کا نسخہ تلف کر دیا جائے گا۔ لیکن ہمیں

یقینی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ پروفیسر کے ساتھ تلف نہیں ہوا بلکہ ڈاکٹر آنگرہ نے پروفیسر بوس کے وکیل لالہ طوطا رام کے ذریعہ سے وصول پالیا ہے"۔

"آپ کو اس سے کیا غرض وہ نسخہ تلف ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، مگر شائع نہیں ہوگا دوسرے آپ نے ڈاکٹر کو مارنے کی فیس دس لاکھ ادا کی تھی، سو آپ کا منشا پورا ہوا۔ اگر جان عزیز ہے تو ...."

"مگر مشکل تو یہ ہے کہ پروفیسر مرا نہیں زندہ موجود ہے"۔ یہ آواز کمرے کے اندر خدا جانے کہاں سے آئی، مگر اُس کا برقی اثر یہ ہوا کہ کنور سین اور پرکاش نرائن دونوں کھڑے ہو گئے اور حیران ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے کمرے کے اندر کونے میں ایک اُونچی الماری کھڑی تھی اُس کا دروازہ کھلا اور کپتان عباس علی خاں دونوں ہاتھوں میں دو پستول لئے ہوئے برآمد ہوئے۔ ایک پستول کی نال کنور سین کی طرف تھی اور دوسری پرکاش نرائن کی طرف۔ "اگر جان عزیز ہے تو دونوں بزدل اپنے ہاتھ اوپر کی طرف اُٹھاؤ"۔ دونوں نے حکم کی فوری تعمیل کی۔ "فرار ہونے کی کوشش کرنا بالکل بیکار ہے کنور سین تم کئی بار میرے ہاتھوں سے نکل بھاگے مگر آج میں نے ایسا انتظام کیا ہے کہ اب تمھارا بھاگنا ناممکن ہے۔ تم نے چاہا تو یہ تھا کہ اپنی کشتی کو فنا کر کے مجھے اپنی موت کا یقین دلادو مگر میں تمھاری چال میں کب آنا تھا کل سہ پہر کو جب تمھاری موٹر کاٹ گودام سے روانہ ہونے کے لئے تیار تھی تو میری موٹر تم سے آدھ گھنٹہ قبل روانہ ہو چکی میں یہ دریافت کر چکا تھا کہ تم الیسیم ہوٹل میں قیام کرو گے لہٰذا تم سے پہلے پہنچ کر اور ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر کو راضی کر کے میں اس

کمرے کی الماری میں چھپ گیا۔ تمھیں ذرا بھی تعجب ہوا ہوگا جب کہ اسسٹنٹ منیجر نے تم سے کہا کہ بجز اس کمرے کے کوئی اور دوسرا کمرہ ہوٹل میں خالی نہیں ہے اور کمرے کی اس الماری میں ہوٹل کا کچھ سامان بند ہے بس اب گرفتاری کے لئے تیار ہو جاؤ۔ پولیس کو اطلاع دی جا چکی ہے۔ تمام ہوٹل پولیس کی نگرانی میں ہے اور اس کمرے کے باہر گیلری میں پولیس کے آٹھ جوان اور ایک سب انسپکٹر میرے وفادار دوست علی شیر کی زیر نگرانی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر خیر کنور سین! باوجود انتہائی شیطانیت کے میں تمھاری اعلیٰ ذہانت کا سچا قدردان ہوں، لیکن اس دنیا کے کتے پرکاش نرائن کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس جان کی قیمت اُس نے دس لاکھ ادا کی تھی وہ زندہ موجود ہے اور اپنی بیوی اور بچی کے پاس پہنچ چکا ہے۔ اب تمھارا علاج صرف یہ باقی ہے کہ تم کو عدالت پھانسی کے تختہ پر لٹکا دے۔" کپتان نے اپنے قدموں پر پڑے ہوئے پرکاش نرائن کو ٹھکرا دیا، مگر وہ جوش میں اپنے دونوں ہاتھ جن میں پستول تھے نیچے کر چکا تھا اور وہ بالکل بھول چکا تھا کہ کمرے میں اُن دونوں آدمیوں کے علاوہ ایک جوان لڑکی بھی موجود تھی جس نے چپکے چپکے کپتان کے پیچھے آکر دونوں ہاتھ مضبوط پکڑ لئے، مگر کپتان نے زور سے جھٹکا دے کر اپنے دونوں ہاتھ چھڑا لئے۔ اتنی مہلت پاکر کنور سین کھڑکی کے قریب ہو گیا لیکن کپتان کو اطمینان تھا کہ پندرہ فٹ کی بلندی سے کودنا کوئی آسان کام نہیں۔ نیز نیچے بھی پولیس کی نگرانی تھی کپتان نے مسکرا کر لڑکی سے کہا۔ "بملا! تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آؤگی؟"

بملا (آنکھوں میں آنسو بھر کر) "عباس علی! تم آج میرے باپ کو قید

کرنے کے لئے آئے ہو۔ ہم نے بھی دنیا میں خوب عیش و آرام دیکھا اور جو کچھ برائی دنیا کے ساتھ ہم نے کی ہے شاید خدا کی طرف سے آج انتقام لیا جائے گا۔ مگر میری ایک تمنا ہے اگر تم قبول کرو تو بڑی بات نہیں ؟"

عباس علی :۔ "بملا! اگرچہ سابقہ تجربہ مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ میں تمھاری کوئی بات بھی سنوں لیکن کہو کیا کہتی ہو ؟"

بملا :۔ "آخر تم میرا اعتبار کیوں نہیں کرتے ؟ میرے والد تمھاری حراست میں ہیں اور رہیں گے۔ تم جانتے ہو کہ ان کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں ان کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔ اگر ان کی قسمت میں پھانسی کے "تختے" پر لٹکنا ہی ہے تو میں بھی آخر ان کے جرائم میں برابر کی شریک ہوں۔ میں ان سے پہلے مرنے کے لئے تیار ہوں مگر اتنی مہربانی کیجئے کہ اپنی زندگی کا آخری فرض ادا کرنے کے لئے مجھے صرف گھنٹہ بھر کی مہلت دیجئے۔ آپ کو معلوم نہیں آج سے دس سال قبل میری ماں نے اسی کوہستان میں جان دی تھی۔ یہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر وہ مقام ہے، جہاں آج ہی کے دن اُن کا وقت آخر ہوا تھا۔ ہر سال میں اور میرے والد دونوں اس مقام پر آکر دو آنسو بہا جاتے ہیں۔ اسی غرض کے لئے ہم یہاں آئے تھے مگر یہ کیا معلوم تھا کہ قسمت کیا گل کھلانے والی ہے ؟"

بملا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ عباس علی ایک بہادر سپاہی کی طرح ایک عورت کے آنسوؤں کو برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے یہ سوچا "اگر یہ واپس بھی نہ آئی تو میرا کیا بگڑے گا اور سچ پوچھئے تو اُس کا قصور بھی کیا ہے۔ کنور سین جو در حقیقت سزا کا مستحق ہے میری گرفت میں ہے۔" یہ سوچ کر

اُس نے بملا سے کہا۔ "اچھا جاؤ، مگر اپنے وعدے کے مطابق ٹھیک ایک گھنٹہ بعد واپس آجانا۔ ہم اس سے زیادہ یہاں انتظار نہ کریں گے۔" بملا نے آنسوؤں کے باوجود مسکراتے ہوئے "شکریہ" کہا اور ایک کوٹ پہن کر باہر نکل گئی لیکن دروازے سے باہر نکلتے ہی مزاحمت کی گئی۔ کپتان نے سیٹی بجائی دو پولیس مین بملا کو لیتے ہوئے کمرے میں آئے۔ کپتان نے حکم دیا کہ پرکاش نرائن کو باندھ کر باہر لے جاؤ اور اس لڑکی کو ہوٹل کے باہر پہنچا آؤ۔ پرکاش نرائن نے بہت منت سماجت کی، پھر طرح طرح کی دھمکیاں دیں مگر سپاہیوں نے ایک نہ سنی اور کمرے سے باہر لے گئے۔ اب کپتان اور کنور سین اس کمرے میں رہ گئے مگر دونوں ایک دوسرے سے گفتگو نہ کرنا چاہتے تھے اِس لئے کمرے پر ایک سکوت کا عالم طاری تھا دونوں اپنے اپنے خیالات میں محو تھے اور آئندہ کے لئے تدابیر سوچ رہے تھے۔ کنور سین کھڑکی سے کمر لگائے کھڑا تھا اور عباس علی دروازے کے قریب ٹہل رہا تھا۔ اسی طرح کامل پون گھنٹہ گذر گیا۔ کپتان عباس علی نے راہِ فرار مسدود کرنے کے لئے جہاں اور انتظامات کئے تھے وہاں جھیل پر ہوٹل کے قریب ایک موٹر بوٹ بھی کھڑا کر رکھا تھا۔ کیونکہ یہ جھیل تقریباً دس میل تک کوہستان میں چلی گئی تھی اور اُس کے کناروں پر کوئی سڑک یا راستہ نہ تھا۔ اس لئے اگر کوئی شخص جھیل کے راستہ سے بھاگ نکلنے کی تدبیر کرے تو موٹر سے اُس کا تعاقب نہیں کیا جا سکتا تھا اور جھیل کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر بڑی آسانی سے آدمی سرحدِ نیپال کی طرف روپوش ہو سکتا تھا۔ اسی غرض سے موٹر بوٹ بالکل تیار تھی۔

کنور سین دفعتہً کود کر کھڑکی پر کھڑا ہو گیا۔ کپتان نے اُس کی مجنونانہ حرکت کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ کود کر جان دینا چاہتا ہے۔ اِس لئے دوڑ کر چاہتا تھا کہ اُس کو پکڑ لے لیکن کھڑکی تک پہنچتے پہنچتے کنور سین نیچے پہنچ چکا تھا۔ کپتان نے جھانک کر دیکھا کنور سین ایک مشّاق نٹ کی طرح بیچ میں قلابازی کھا کر صحیح سلامت نیچے اُترا اور سیدھا جھیل کے کنارے کی طرف بھاگا۔ اب کپتان نے دیکھا کہ جہاں اُس کی اپنی موٹر بوٹ کھڑی تھی اُس کے پاس ہی ایک اور موٹر بوٹ موجود تھی۔ کپتان نے محسوس کیا کہ اُس کی تمام تجاویز خاک میں مل چکیں۔ تاہم ایک آخری کوشش کرنے کے لئے وہ بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ راستہ میں علی شبیر اور کئی سپاہی کھڑے پہرہ دے رہے تھے کپتان کے اشارہ پر یہ بھی اُس کے پیچھے بھاگے اور تمام ہوٹل میں اِس شور و غل سے ایک ہل چل مچ گئی۔ لوگ جو یہاں مقیم تھے اکثر کمروں سے باہر نکل آئے اور بعض تنگ مزاجوں نے نوکروں کو بلانے اور شور و غل بند کرانے کے لئے زور زور سے گھنٹیاں بجائیں۔ مگر ملازمین خود اِس پُر اسرار بھاگ دوڑ کی طرف متوجہ تھے۔ کپتان کو حیرت تھی کہ وہ دو سپاہی جو ہوٹل کی پشت کی طرف تعینات تھے کہاں گئے؟ مگر اس کی تحقیقات کا ابھی موقعہ نہ تھا کنارے تک پہنچتے پہنچتے کنور سین کی موٹر بوٹ کافی دور نکل چکی تھی اپنے ساتھیوں کو بغیر کسی قسم کی ہدایت دئے ہوئے کپتان اپنی موٹر بوٹ میں کود پڑا اور حکم دیا کہ جلد موٹر بوٹ آگے جانے والی کشتی کے تعاقب میں روانہ ہو۔ مگر ڈرائیور بہرہ بنا اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ کپتان نے غصہ سے بیتاب ہو کر زور سے

کو بس کا شانہ ہلایا، مگر وہ اس طرح اپنی سیٹ سے گرا جیسے مٹی کی مورت تھی
کپتان نے کود کر اُس کی جگہ لی اور خود موٹر بوٹ کو چلانے کی کوشش
کی۔ لیکن معلوم ہوا کہ کسی پُرزے کے توڑ دینے سے انجن قطعی بیکار ہو چکا ہے
اب کپتان نے موٹر بوٹ کی پچھلی نشستوں پر نظر ڈالی اور دیکھا اِن نشستوں
کے نیچے دو سپاہی مٹی کے بوروں کی طرح پڑے ہیں۔ کپتان نے مایوس
ہو کر ایک آہِ سرد بھری اور کنور سین کی کشتی کی طرف دیکھا۔ کشتی بہت دور
نکل چکی تھی۔ مگر اُس کے پچھلے حصے پر اب بھی بلا کھڑی ہوئی اپنا رومال ہلا رہی
تھی * * * * * * *

شعلۂ غضب

(۱)

پُراسرار حادثہ

اوائل سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۲۰ء کے آخر تک اکثر اخبارات میں ایک طویل واقعہ کے منتشر اجزاء وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ اخبار بیں حضرات کی نظر سے یہ واقعات ضرور گذرے ہوں گے لیکن ہزاروں میں دو چار ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے اِس امر پر غور کیا ہو کہ یہ تمام واقعات ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں اور اسی لئے یہ حیرت انگیز واقعہ پبلک کی نظروں میں کوئی اہمیت حاصل نہ کر سکا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ ان تمام اجزائے منتشرہ کو یکجا کر کے اس پر غور کریں تو دلچسپی اور اچھوتے پن کے لحاظ سے دلکش ترین افسانہ بھی باوجود تخیّل کی بلند پروازیوں کے اِس سچے واقعہ سے سبقت نہیں لے جا سکتا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ابتداء ہی سے مجھے ان واقعات سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس سلسلہ میں جس قدر خبریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں

میں اِن سب کو یکجا کرتا رہا اور اب جو کچھ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اُس کا مواد تمامتر انہیں اخبارات سے حاصل کیا گیا ہے۔ صرف ترتیب یا بعض مقامات پر واقعات کی وضاحت کا ذمہ دار میں ہوں۔

جس وقت یہ کام میں نے شروع کیا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ بہت جلد اِن واقعات کے ساتھ خود میری ذات کا تعلق پیدا ہو جائے گا۔ لیکن دنیا میں اکثر ایسے عجائبات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

چند ہی روز کے بعد وہ حادثہ پیش آیا جس نے مجھے اِس ڈرامہ کا کردار بنا دیا۔ ایک شب میں کلب سے تقریباً نو بجے واپس آیا۔ مارچ کا مہینہ قریب الاختتام تھا۔ میرے پاس ان دنوں کام کی کثرت تھی۔ مقدمات کی پیروی کرتے کرتے ضعیف مُنغّص ہو جاتی تھی۔ میرے دوست میاں شیر علی خان اس زمانہ میں میرے پاس ہی مقیم تھے اور اُن کی پُر لطف صحبت سے دن بھر کی کلفت دور ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ خلافِ معمول شیر علی کچھ چُپ چُپ سے تھے۔ میں نے سبب پوچھا لیکن وہ ٹال گئے۔ دفعتہً میری میز پر ٹیلیفون کی گھنٹی بڑے زور سے بجی۔ میں نے ہنس کر کہا "یہ کون بدحواس ہے"۔ مگر میں نے دیکھا کہ شیر علی نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ ٹیلیفون کا رسیور اُٹھا کر کان سے لگایا۔ اُن کی گھبراہٹ دیکھ کر میں بھی پاس کھڑا ہو گیا، اور اپنا کان جس قدر ممکن تھا رسیور کے قریب کر دیا۔ یہ آواز آ رہی تھی "شیر علی! شیر علی!! جلد...!!" اِس کے بعد ایک زور کے دھماکے کی آواز آئی۔ شیر علی نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا "ڈاکٹر! ڈاکٹر مجیب الدین!!" مگر اُدھر سے کوئی آواز نہ آئی۔ شیر علی نے

دفتر سے کنکشن ملانے کے لئے کہا۔ مگر کنکشن ملانے کی تمام کوششیں بیکار ثابت
ہوئیں اور معلوم ہوا کہ لائن خراب ہو گئی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن شیر علی نے
میرے دونوں کاندھوں کو پکڑ لیا اور ایک درد بھری آواز میں یہ مختصر الفاظ کہے۔
"بھئی شرما! اس وقت میری مدد کرو اور بغیر کچھ پوچھے میرے ساتھ چلے آؤ" بغیر
جواب کا انتظار کئے ہوئے شیر علی دروازہ کی طرف مڑا اور ایک پوشیدہ طاقت نے
مجھے اُس کے ساتھ جانے پر مجبور کیا۔ آگے پیچھے ہم دونوں کوٹھی سے باہر آئے
لیکن کچھ ہی دُور بہت تیز تیز پیدل چلے۔ آخر ایک تانگہ سامنے سے آتا ہوا ملا۔
بڑی تیزی کے ساتھ ہم اُس پر سوار ہوئے۔
"دیکھو! انیس ہزاری کوٹھی نمبر ۱۳ پر لے چلو جس قدر تیز تمہارا گھوڑا بھاگ
سکتا ہے بھگاؤ۔ انعام ملے گا"۔
رات کا وقت تھا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ گھوڑا پوری رفتار سے بھاگا
چلا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ شیر علی سے کچھ پوچھوں لیکن خدا جانے کیوں مجھ پر
ایک ایسا خوف طاری ہو گیا تھا کہ زبان ہلانے کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی۔ بیس
منٹ کے بعد تانگہ کوٹھی نمبر ۱۳ کے اندر داخل ہوا اور تانگے سے اُترتے ہی
قریب کے کسی درخت پر ایک اُلّو بولا۔ اِس سنسان مقام میں رات کے گیارہ
بجے اُس کی کرخت اور پریشان کن آواز سے میرا دل پتّے کی طرح ہلنے لگا افسوس
میں اپنا پستول بھی گھر بھول آیا تھا اور جلدی میں چھڑی بھی نہ لی تھی۔ مگر
شیر علی خدا جانے کس دھن میں تھا کہ میرا ہاتھ پکڑا اور بھاگا ہوا کوٹھی میں گھس
گیا۔ دو تین دروازوں میں دھکا دیا۔ سب اندر سے بند ملے۔ آخر کار ایک زینہ

نظر آیا اور ہم دونوں اوپر چڑھ گئے۔ اُوپر دو کمرے تھے اور دونوں میں بجلی کی روشنی تھی۔ ایک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم اُس کے اندر داخل ہوئے۔ کمرے کے اندر سب سے پہلے جس چیز پر ہماری نظر پڑی وہ ٹیلیفون بکس تھا۔ اُس کا ریسیور ٹوٹا ہوا کمرے کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا لیکن تمام چیزیں اس طرح بکھری ہوئی تھیں جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ دو آدمیوں میں اچھی خاصی کشتی ہوئی ہے۔ اِس کمرے میں سے ہو کر ہم دوسرے کمرے میں گئے۔ قریب تھا کہ میرے مُنہ سے چیخ نکل جاتی لیکن شیر علی نے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک شخص کمرے کے وسط میں مرا ہوا پڑا تھا۔ مَیں نے شیر علی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور دوسرے کمرے میں بھاگ جانا چاہا۔ شیر علی میرے ساتھ واپس آ گیا دوسرے کمرے سے باہر صحن میں آ کر مَیں نے کہا۔ "ڈاکٹر، دوست تمہارا"۔ شیر علی نے سر ہلا کر انکار کیا اور مجھے ساتھ لئے ہوئے زینہ سے نیچے اُتر گیا۔ نیچے پہنچ کر اُس نے مجھے تانگے میں بٹھا دیا اور کہا۔ "سبزی منڈی کے تھانے جاؤ اور انسپکٹر صاحب کو بلا لاؤ"۔ میں اس وقت شیر علی سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن انکار بھی نہیں کر سکتا تھا اور اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ شیر علی تانگے میں بیٹھ کر تھانے چلا جائے اور میں اکیلا وہاں کھڑا رہوں۔ میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ تانگے والے نے خود ہی گھوڑا ہانک دیا اور تھوڑی دیر بعد مَیں تھانے میں جا اُترا۔ سب انسپکٹر صاحب موجود تھے۔ یہ حال ہی میں کہیں باہر سے تبدیل ہو کر آئے تھے اور مجھ سے ناواقف تھے اِس لئے میں نے اُنہیں بتایا کہ میرا نام سری رام شرما ہے اور یہ بھی بتایا کہ میں وکیل ہوں، لیکن جب میں نے اِس قتل کی واردات کا ذکر کر کے

اُن سے ساتھ چلنے کی درخواست کی تو اُنہوں نے صاف انکار کر دیا اور جب میں نے بہت زیادہ اصرار کیا اور قانونی دفعات سمجھائیں تو اُنہوں نے صرف دو کانسٹیبل میرے ساتھ بھیج دیے۔ جب ہم واپس کوٹھی نمبر ۱۳ میں داخل ہوئے تو ہم نے شیر علی کو ایک مستعد سنتری کی طرح زینہ کے دروازے پر پہرہ دیتے ہوئے دیکھا۔ ہم سب پھر اُوپر گئے۔ سپاہی گمنام قاتل کو بار بار گالیاں دے رہے تھے۔ شیر علی سب سے آگے اور میں سب سے پیچھے۔ اِس طرح ہم سب اس کمرے میں داخل ہوئے۔ سپاہیوں میں سے ایک مقتول کے کپڑوں کی تلاشی لینے کے لئے جُھکا۔ کپڑوں کو چھوتے چھوتے ایک بار اُس سپاہی نے مقتول کے چہرے کو ہاتھ لگایا اور ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ اُس کے ہاتھ پیر ٹیڑھے ہو گئے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور تنفس بند ہو گیا۔ ایک اچانک موت کو دیکھ کر ہم سب لوگ کانپ اُٹھے اور فوراً کمرے سے باہر نکل آئے دوسرے کمرے میں دوسرے سپاہی نے ایک کوچ کے نیچے سے ایک ہیٹ نکالی ہیٹ پر اندر کی طرف لکھا تھا۔ "ساخت آسٹریلیا"۔ یہ لفظ دیکھ کر شیر علی چونک پڑا۔ اب یہ صلاح ٹھہری کہ پولیس مین یہیں لاشوں کا پہرہ دے اور ہم دونوں پھر ایک بار تھانے جا کر انسپکٹر صاحب کو بلا لائیں۔ چنانچہ ہم دونوں تانگے میں بیٹھ کر پھر تھانے آئے اور انسپکٹر صاحب کو دوسرے حادثہ کی اطلاع دی۔ انسپکٹر صاحب بہت سخت ناراض ہوئے لیکن خیر وردی پہن اور پستول لے کر ہمارے ساتھ ہو لئے اور مزید احتیاط کے طور پر مسلح پولیس کے دو سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر ساتھ ہوئے۔ موقعہ واردات پر آئے۔ سپاہی کمرے کے باہر پہرہ

دے رہا تھا۔ انسپکٹر صاحب نے پہلے اُس سے بہت سے سوالات کئے۔ پھر کمرے کے اندر گئے۔ دونوں کمرے خوب اچھی طرح سے دیکھے۔ کسی انسان کی لاش اُن میں سے برآمد نہ ہوئی، لیکن پلنگ کے نیچے دو چوہے مرے پڑے تھے اور الماری کے پیچھے ایک خوب صورت کُتا بھی مرا پڑا تھا۔ جس کے متعلق شیر علی خاں نے بتایا کہ ڈاکٹر مجیب الدین یہ کُتا اپنے ہمراہ فرانس سے لائے تھے اور اُس کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ سپاہی کی موت کا واقعہ ایسا پیش آچکا تھا کہ لاشوں کے قریب کوئی نہ جاتا تھا۔ تمام کمرے کی تلاشی لی گئی مگر کوئی کام کی بات نہ ملی۔ انسپکٹر صاحب نے ہمارے اور سپاہی کے بیانات قلمبند کئے تینوں سپاہی پہرے پر مقرر کر کے خود واپس تھانے چلے گئے اور بڑی ردّ و قدح کے بعد ہمیں بھی گھر جانے کی اجازت دی۔

۲۔ ڈاکٹر مجیب الدین

علی شیر خاں نے جو واقعات مجھے بتائے وہ نہایت حیرت انگیز تھے مگر اُن کے سُننے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اُن سے متعلق بعض خبریں وقتاً فوقتاً اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ میں نے اپنے اخبارات کے فائل سے تلاش کر کے اُن کو یکجا جمع کر لیا۔ میری محنت رائیگاں نہیں گئی، کیونکہ ان اخبارات سے بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن سے واقعہ کے بعض تاریک پہلوؤں پر روشنی پڑتی تھی۔

ڈاکٹر میجر مجیب الدین خاں نے جنگ عظیم سے چھ سال پیشتر انگلستان اور جرمنی میں طب و سرجری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اُس کے بعد وہ براہِ راست فوجی خدمت پر مامور ہوئے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کے باعث اُنہوں نے بہت جلد اپنے افسروں کی نظروں میں بڑی وقعت حاصل کر لی جنگ کے دَوران میں محاذِ غربی پر کام کیا۔ اسی زمانہ میں اُن کی توجہ جدید طریق جنگ اور مہلک سائنٹفک ایجادوں کی جانب مبذول ہوئی اور فرصت کے مختصر لمحات میں جو ڈاکٹر صاحب باوجود کثرتِ مشاغل ضرور کسی نہ کسی طرح نکال لیتے تھے۔ اُنہوں نے تجربات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ ابتداءً سخت ناکامیوں سے واسطہ پڑا مگر بالآخر کامیابی کی جھلک نظر آنے لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے جولائی ۱۹۱۸ء میں دو سال کی رخصت حاصل کی اور ہندوستان واپس چلے آئے۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دَورانِ جنگ میں ڈاکٹر صاحب نے سمّیات کی تحقیق و علاج میں مہارتِ خاص و شہرتِ عام حاصل کی تھی اور جس وقت آپ نے دو سال کی رخصت حاصل کی تھی اُس وقت بھی کسی اخبار نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ ڈاکٹر مجیب الدین سمّیات ہی کے متعلق مزید تحقیقات کرنے کے لئے رخصت پر جا رہے ہیں اور اُمید کی جاتی ہے کہ اُن کے تجربے ایک حیرت انگیز انکشاف پر ختم ہوں گے۔ شیر علی خاں سے معلوم ہوا کہ جس شب کو مذکورہ بالا واقعات پیش آئے اُسی روز صبح کے وقت شیر علی خاں کے پاس ڈاکٹر مجیب الدین آئے تھے۔ ڈاکٹر مجیب الدین اور شیر علی خاں کے تعلقات دوستانہ بہت گہرے اور پُرانے تھے۔ ان تعلقات کی بناء پر ایک

نہایت نازک موقع پر اپنی زندگی کا ایک راز بتانے کے لئے شیر علی خاں کو منتخب کیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ "جنگ عظیم کے ہولناک مناظر اور بے شمار انسانی جانوں کا نقصان اور دردناک مصائب دیکھ کر میرا دل کُڑھا اور میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس خوفناک حادثے کے اعادے کو روکنے کی صرف ایک صورت ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی ایسا خطرناک آلۂ حرب ایجاد کیا جائے جس کے خوف سے قومیں جنگ سے باز آ جائیں۔ اس غرض کے لئے میں نے چاہا کہ ایک ایسا مہلک اور زود اثر زہر دریافت کروں جس کا ایک قطرہ سینکڑوں آدمیوں کے لئے یقینی اور فوری موت کا باعث ہو مگر دشمن کی فوجوں کو ایک قطرہ زہر کا کیونکر دیا جا سکتا ہے۔ زہر کا اثر اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ خون میں پہنچے اور خون میں پہنچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کھا کر یا پی کر زہر معدے میں پہنچے اور پھر خون میں شامل ہو، دوسرے زہر انجکشن کے ذریعہ سے براہ راست رگوں میں داخل کیا جائے۔ اِن دونوں صورتوں میں دشمن کے قریب پہنچنا اور اُس کو قابو میں لانا ضروری ہے اور یہ محال ہے مگر ایسی ادویات موجود ہیں جن کی چھینٹ بھی اگر جسم کے کسی حصہ پر پڑ جائے تو فوراً آبلہ پڑ جاتا ہے اور اگر دوا کافی تیز ہو تو یہ آبلہ پڑتے ہی پھوٹ جاتا ہے اور اس طرح دورانِ خون سے جو آبلے کے کھال کے بیرونی حصہ کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ ان باریک سوراخوں سے پھوٹنے نیز پڑ جاتے ہیں زہر اندر سرایت کر سکتا ہے۔ اب اگر کسی آبلہ ڈالنے والی دوا کو کسی ایسے مہلک زہر میں ملایا جا سکے جس کا اثر آمیزش سے زائل نہ ہو جائے تو مطلوبہ صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ میں نے سالہا سال کی جدوجہد کے بعد

آخر ایک ایسا ایکسچر معلوم کرلیا ہے اور اُس کا تریاق بھی دریافت کرلیا ہے، اس لئے کہ بغیر تریاق کے دریافت کئے ہوئے یہ سائنٹفک انکشاف نامکمل رہتا۔ چند ماہ سے صرف اِس کوشش میں تھا کہ اِس دوا کو دشمن کی افواج پر چھڑکنے کا آسان ترین اور یقینی طریقہ دریافت کروں۔ اسی دَوران میں ایک آسٹریلیا کا باشندہ اور ایک متموّل تاجر مسمی براڈریج مجھ سے ملا۔ اُس کو کسی ذریعہ سے میری ایجاد کا پتہ لگا تھا اور وہ اُس کے متعلق مجھ سے گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھے ایک کثیر رقم کا لالچ بھی دیا لیکن میں خوب سمجھتا تھا کہ یہ ایجاد انفرادی طور پر کسی ایک آدمی کے ہاتھ میں پہنچ کر جس قدر مہلک ثابت ہوگی اسی قدر ایک طاقتور اور انصاف پسند حکومت کے ہاتھ میں یہ نسلِ انسانی کے لئے رحمت بن سکتی ہے کیونکہ یہ حکومت اس خوفناک آلۂ حرب کی وجہ سے دنیا کی تمام قوموں کو جنگ سے باز رکھ سکتی ہے۔ مَیں کمانڈرانِ چیف سے مِل چکا ہوں اور اُن سے معاملہ کی تمام جزئیات طے پا چکی ہیں۔ کل کی تاریخ اس بات کے لئے مقرر کی گئی ہے کہ ایک خفیہ بورڈ کے سامنے جس میں فوج کے اعلیٰ ترین حکام شامل ہوں گے میں اپنے دعوے کا عملی ثبوت پیش کروں گا۔ آج کا دن میری زندگی میں نہایت قیمتی ہے اور میں حد سے زیادہ پریشان ہوں۔ براڈریج آج شب کو مجھ سے ملنا چاہتا ہے مَیں اُس کی ملاقات سے انکار بھی نہیں کرسکتا نہ کسی اور کو اس وقت بلانا چاہتا ہوں۔ تم سے صرف یہ درخواست ہے کہ آج شب کو تم اپنی قیام گاہ پر منتظر رہنا جس وقت میں ٹیلیفون پر تم کو بلاؤں، بلا پس وپیش چلے آنا۔"

ڈاکٹر مجیب الدین کی مذکورہ بالا تقریر کا خلاصہ شیر علی خاں نے پہلے

مجھے سنایا۔ ابھی پوری طرح ختم بھی نہ کر چکے تھے کہ کپتان عباس علی خاں آپہنچے اور ہم دونوں نے اُن کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا، کیونکہ اس مشکل کو حل کرنے میں اُن سے زیادہ کون ہماری مدد کر سکتا تھا چنانچہ ماسبقہ شب کا واقعہ اور ڈاکٹر حبیب الدین کی تقریر کا مفہوم پھر دوبارہ شبیر علی خاں نے کپتان کو سنایا کپتان نے اُن کو سننے کے بعد انتہائی دلچسپی کا اظہار کیا۔

کپتان ۔ "جیتے رہو صاحبزادے! صبح ہی صبح دل خوش کر دیا"

شبیر علی ۔ یہ کیا نامعقول گفتگو ہے۔ ارے میاں ہم تو پریشان ہیں آپ ہمدردی کرنے سے رہے اور اُلٹا خوش ہو رہے ہیں یہ کون سی انسانیت ہے؟ معلوم نہیں بیچارہ ڈاکٹر کس حال میں ہوگا اور کہاں ہوگا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لاش کس کی ہے؟ بظاہر تو براڈریج کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ وہ رات کو اُن سے ملنے کے لئے آنے والا تھا ہیٹ بھی آسٹریلیا کی بنی ہوئی وہاں ملی ہے اور براڈریج آسٹریلیا ہی کا رہنے والا تھا مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ ڈاکٹر کہاں چلا گیا"

میں نے جلدی سے کہا۔ "بہت ممکن ہے کہ براڈریج نے زیادتی کی ہو اور اس پر دونوں میں لڑائی ہوئی ہو جیسا کہ کمرے کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا اور اتفاقاً لڑائی میں ڈاکٹر کے ہاتھ سے نادانستہ ایسی ضربِ شدید لگی ہو جس سے براڈریج مر گیا ہو اور پھانسی اور بدنامی کے خوف سے ڈاکٹر روپوش ہو گیا ہو"

کپتان ۔ "شاباش صاحبزادے! خوب سمجھے جات تو معقول ہے

مگر یہ تو بتاؤ کہ براڈرِج کو یہاں کوئی جانتا بھی ہے؟"

شیر علی۔ "ممکن ہے پولیس نے کچھ پتہ لگایا ہو مگر مشکل یہ ہے کہ لاش بھی تو غائب ہو گئی"۔

کپتان۔ "میں بھی وہ مکان دیکھنا چاہتا ہوں"۔

کپتان یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ڈاک آئی میں نے اخبار کھولا تو رات کے حادثہ کی خبر جلی قلم میں فنِ صحافت کے مبالغہ کے ساتھ مفصل درج تھی۔ ابھی ہم اُس کو پڑھ ہی رہے تھے کہ سائیکل پر سوار ایک اردلی کا چپراسی سُرخ وردی پہنے سنہری پٹی لگائے کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوا اور شیر علی خاں کو پوچھ کر اُن کے نام ایک خط کمانڈر انِ چیف کے پرائیویٹ سکریٹری کا دیا۔ معلوم ہوا کہ شیر علی کو پرائیویٹ سکریٹری نے فوراً طلب کیا ہے۔ اردلی کے رخصت ہوتے ہی ہم تینوں دوستوں میں مشورہ ہوا اور قرار پایا کہ کپتان تنہا جاکر اُس مکان کو جہاں حادثہ پیش آیا تھا دیکھ آئیں اور شیر علی کمانڈرانِ چیف صاحب کے چیف سکریٹری سے ملنے کے لئے جائیں۔ شام کو سب کپتان صاحب کی کوٹھی پر جمع ہوں۔

۳۔ سُراغ کی پہلی منزل

اِس کے بعد میں کچہری گیا لیکن واقعات سے میرا دماغ اس قدر متأثر ہوا تھا کہ بالکل کام میں جی نہ لگا اور خیالات بار بار اِس حادثہ کی جانب رجوع

ہوتے رہے، پریشان ہو کر جلد ہی گھر چلا آیا۔ شیر علی آ گئے تھے، اُن سے کیفیت پوچھی تو معلوم ہوا کہ کمانڈر اِن چیف صاحب کو اس حادثہ کی اطلاع صبح ہی صیغۂ سُراغ رسانی نے پہنچا دی ہے اور وہ اس معاملہ میں بہت محتاط ہیں محکمہ معاملہ کی تفتیش خفیہ کرے گا۔ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ ہم دونوں اس معاملہ میں بالکل خاموش ہو جائیں۔ پولیس کو بھی خاص ہدایات دی جائیں گی غرض ان باتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ معاملہ حکومت کی نگاہوں میں کس درجہ اہم ہے۔ یہ بھی سکریٹری صاحب نے کہا کہ خفیہ طور پر ہمیں ایک تحریری بیان دیا جائے گا وہی ہم عدالت کے سامنے بیان کر دیں۔ شیر علی کو اطمینان دلایا کہ محکمۂ سُراغ رسانی ڈاکٹر مجیب الدین کا پتہ لگانے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

ڈاکٹر مجیب الدین نے عمر بھر شادی نہیں کی اور نہ کوئی اُن کا قریبی عزیز زندہ تھا۔ اِس لئے حکومت کو اطمینان تھا کہ سوائے ہم دونوں کے کوئی تیسرا شخص اس معاملہ سے دلچسپی رکھنے والا نہیں۔ نہ حکومت کو اِس سے غرض تھی کہ ڈاکٹر مجیب الدین زندہ رہیں یا مارے جائیں۔

پانچ بجے کے قریب ہم دونوں کپتان عباس علی خاں کی کوٹھی واقع دریا گنج گئے۔ کپتان ہمارا انتظار ہی کر رہے تھے۔ علی شیر نے تمام گفتگو جو چیف سکریٹری صاحب سے ہوئی تھی کپتان کو سنائی۔ کپتان کا چہرہ آج غیر معمولی طور پر اُترا ہوا تھا اور وہ بہت متفکر نظر آتا تھا۔ ہم لوگ باغ میں ٹہل رہے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ ٹہلتے ہوئے ہم ایک بار ایک ایسی روش

سے گذرے جس کے کنارے ایک بہت بڑی ولایتی جھاڑی تھی جو بہار کے پھولوں سے لدی ہوئی تھی چلتے چلتے جب ہم اُس سے گذر گئے تو کپتان پلٹا اور ایک سترہ اٹھارہ برس کے سیاہ فام لڑکے کو جو ایک پھٹی ہوئی سی میلی پتلون اور کھلے گلے کی قمیص پہنے ہوئے تھا ہاتھ پکڑ کر جھاڑی سے باہر کھینچ لیا اور پہلے گردن پکڑ کر خوب جھنجھوڑا پھر پوچھا "کون ہے؟" لڑکا پہلے خاموش رہا پھر دو چار مکّے کھا کر کہنے لگا۔ "میں ویسے ہی چمن کے پھول دیکھنے اور ہوا کھانے کے لئے جھاڑی کے اندر بیٹھا تھا۔" کپتان نے اُس کا گلا دبا کر کہا۔ "بچہ سچ بتا دو کہ کس نے بھیجا ہے اور کیوں بھیجا ہے اور کتنے ٹکے دئے ہیں؟ جھوٹ بولا تو تمھاری جان کی خیر نہیں۔"

کپتان نے گلا چھوڑ دیا مگر لڑکا خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ "جناب معاف کیجئے میں بتاتا ہوں مجھے ایک شخص جامع مسجد پر ملا تھا وہ مجھے پریڈ کے میدان میں ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا کہ لو یہ پانچ روپے اور کپتان عباس علی خاں صاحب کی کوٹھی میں بیٹھ جاؤ اور دیکھتے رہو کون کون آیا اور شام کو اگر صحیح صحیح خبر دو اگر غلط بیانی ثابت ہوئی تو سزا ملے گی نہیں تو پانچ روپے اور ملیں گے۔

کپتان۔ "اچھا تو تمھیں شام کو کس وقت اور کہاں بلایا ہے؟"

لڑکا۔ "مجھ سے تو یہ کہا ہے کہ شاہ بولا کے بڑ پر جو کلوار ہے وہاں رات کو نو بجے آنا۔"

کپتان (ایک نوٹ دے کر) "تو یہ دس روپے۔ اب بولو کیا رپورٹ دوگے؟"

لڑکا کپتان کے چہرہ کو غور سے دیکھ کر نوٹ لیتے ہوئے "جو آپ کہیں"۔
کپتان۔ "کہہ دینا کہ بس پچیس آدمی آئے اور آٹھ دس موٹریں آئیں آنے والے اکثر فوجی آدمی تھے اور کئی مہاجن تھے"!

کپتان کی باتیں سُن کر سب مسکرانے لگے۔ لڑکے نے وعدہ کیا، اور سلام کر کے جانے لگا تو کپتان نے پھر بُلا کر کہا "دیکھو اگر پھر کوئی یہاں تمھیں ہماری کوٹھی کا پہرہ دینے کے لئے بٹھائے تو پہلے آ کر ہم سے انعام لے جانا"!

آٹھ بجے شب کو کھانے سے فارغ ہو کر ہم تینوں نے کپتان کے حکم کے مطابق بھیس بدلا اور چپکے سے کوٹھی سے باہر نکل گئے۔ جامع مسجد سے گذرے اور چاوڑی بازار میں داخل ہوئے۔ چونکہ اس سے قبل مجھے کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا تھا اس لئے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ بازار میں ہر شخص مجھے ہی گھور رہا ہے اگرچہ کپتان کے خیال سے میں چپ ہو رہا لیکن مجھے اس طریق کار سے بالکل اتفاق نہ تھا۔ بعض میرے جاننے والے بھی راستہ میں ملے اور میں پیچھے ہٹنے لگا لیکن وہ پاس سے نہایت بے التفاتی کے ساتھ گذر گئے۔ اس کے بعد میری ذرا ہمت بندھ گئی۔ اب ہم نہایت استغنار کے ساتھ شراب خانہ میں داخل ہوئے اِدھر اُدھر بہت سے آدمی الگ الگ یا دو دو تین تین کی ٹولیاں بنا کر بیٹھے ہوئے چسکی لگا رہے تھے، مختلف لوگوں پر نشے کی مختلف کیفیات طاری تھیں، بعض کی آنکھیں بالکل بند تھیں اور صرف کبھی کبھی سُرور سے ذرا بیدار ہو کر کچھ آواز لگا جے اور ایک ہاتھ میں جو بوتل پکڑے ہوئے تھے اُس میں سے تھوڑی سی شراب اپنے کوزے

میں ڈال کر پی جاتے۔ بعض استفراغ کر رہے تھے، بعض بالکل غین تھے، شراب کا اثر بھی مختلف لوگوں پر مختلف تھا بعض خوش تھے، بعض مدہوش تھے، بعض آپس میں لڑ رہے تھے اور خود کو ہشیار بتاتے اور دوسروں کو بیہ مست گنتے تھے کہیں گالیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی، کہیں شعر خوانی ہو رہی تھی۔ غرض اس کریہہ منظر کو دیکھ کر طبیعت بڑی مکدر ہوئی۔ مگر ہمیں تو یہی پارٹ کرنا تھا۔ اس لئے ہم نے اپنا حصّہ دُکان سے خریدا اور بے تکلف ایک کونے میں بیٹھ کر شراب کی بوتل تو سامنے رکھ لی اور جیب سے ایک اور کالی بوتل پانی سے بھری ہوئی نکالی اور ساتھ لائے ہوئے کوزے میں پانی پی پی کر اوروں کی طرح بکواس کرنے لگے۔ آنے جانے والوں پر ہماری نظر تھی۔ ہم سے کچھ دیر بعد ایک بہت موٹا آدمی ریلوے گارڈ کی وردی پہنے اور ایک بہت بڑا اسلاک کا پگڑ باندھے ہوئے آیا اور بے تکلف شراب پینے میں مشغول ہو گیا، مگر عجیب بات تھی کہ وہ اور لوگوں سے باتیں کر رہا تھا لیکن اُس کی نظر ہم تینوں پر جمی ہوئی تھی اور بڑی مشتبہ نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ علاوہ بریں وہ نشہ میں چور تھا لیکن پھر بھی ہم محسوس کر رہے تھے کہ وہ پوری طرح ہشیار ہے۔ تین آدمیوں کی ایک اور پارٹی بھی ایک طرف بیٹھی تھی جس کی بعض باتوں سے ہمیں کچھ شبہ ہوتا تھا۔ ان میں سے دو ہم سے پیشتر موجود تھے لیکن تیسرا بعد میں آیا اور اُس نے آکر ان دونوں کو علیحدہ لے جا کر کچھ باتیں کیں اور ہماری طرف اشارہ کیا۔ نو بجے اُس لڑکے کا ہمیں سخت انتظار تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ ساڑھے دس بج گئے اور وہ نہ آیا۔ آخر کلوار نے دُکان بند کرنی شروع کی اور لوگوں کو نکالنے لگے۔ سب لوگ چلے گئے یا دوسرے اُن کو پکڑ کر یا اُٹھا کر لے گئے

صرف وہ تینوں آدمیوں کی پارٹی اور گارڈ کی وردی پہنے ہوئے موٹا آدمی اور ہم تینوں رہ گئے۔ ہم سب ساتھ دروازے سے نکلے تو ان تینوں آدمیوں میں سے ایک نے زیرِ لب کہا۔ "کوٹھی نمبر ۳، تیس ہزاری" اگرچہ اُس نے یہ الفاظ آہستہ کہے تھے لیکن یہ شبہ ہوتا تھا کہ ہمیں سُنانا مقصود ہے۔ دُکان سے باہر نکل کر گارڈ نُما آدمی نے ایک تانگہ کیا اور اُن تینوں نے ایک علیحدہ تانگہ لیا۔ ہم کچھ دُور پیدل چلے اور جب یہ دونوں تانگے چاندنی چوک کی طرف روانہ ہو گئے تو ہم بھی ایک تانگے میں بیٹھے اور اُن کے پیچھے چلے۔ گھنٹہ گھر پر پہنچ کر گارڈ تو قلعہ کی طرف چل دیا اور وہ تینوں فتح پوری کی طرف مُڑے۔ کپتان نے اِن تینوں کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ان کے پیچھے پیچھے ہم تیس ہزاری کے میدان میں آئے یہاں وہ تینوں تانگہ سے اُتر کر ایک مکان کے اندر چلے گئے۔ کپتان نے کچھ دیر تامل کیا اور پھر تانگہ والے کو حکم دیا کہ کوٹھی نمبر ۳، لے چلو ؛

تانگہ کوٹھی نمبر ۳، کے آگے رُکا۔ ہم سب تانگے سے اُترے اور تانگے کو رخصت کر دیا۔ کوٹھی بالکل سُنسان تھی۔ اندر داخل ہوئے چاروں طرف پھرے بالائی منزل سے رہ رہ کر ایسی آواز آتی تھی جیسے کوئی شخص ٹھہر ٹھہر کر کسی کھڑکی پر مُکا مارتا ہے۔ یہ بات قرار پائی کہ مزید تحقیقات کے لئے میں اور علی شیر نیچے ٹھہریں اور کپتان اُوپر جائیں۔ مکان کے اندر سخت تاریکی تھی مگر اُوپر کی منزل میں جہاں سے وہ آواز آ رہی تھی بجلی کی روشنی تھی۔ کپتان کو تاریکی میں نہایت خاموشی کے ساتھ چلنے پھرنے کی بڑی مشق تھی۔ اُنہوں نے مکان کے اندر داخل

ہو کر بہت جلد ایک زینہ معلوم کر لیا جس سے گذر کر وہ اُس کمرے میں پہنچے جہاں روشنی تھی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ وہی لڑکا جو مخبری کے لئے کپتان کی کوٹھی پر تعینات کیا گیا تھا اِس کمرے کی چھت میں رسّی باندھ کر اُس کے ذریعہ سے اُلٹا ٹانگ دیا گیا ہے اور جب تڑپ کر وہ ہلتا ہے تو اُس کا سَر زور سے ایک کھڑکی سے ٹکراتا ہے اور اس طرح وہ آواز پیدا ہو رہی ہے جو ہم نے نیچے سُنی تھی۔ کپتان نے جیب سے چاقو نکال کر رسّی کاٹی اور بیہوش لڑکے کو اُتار ہی رہا تھا کہ دفعتاً اُس کی نظر دیوار میں ایک سوراخ پر پڑی جس میں دو خوفناک آنکھیں چمک رہی تھیں کپتان نے لڑکے کو وہیں چھوڑا اور خود کود کر اُس دیوار کے برابر آ گیا جس میں وہ سوراخ تھا۔ ایک لمحہ میں سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور کسی پچکاری سے ایک فوارہ نکلا جو بیہوش لڑکے پر پڑا۔ وہ دو تین بار تڑپا اور اُس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ کپتان نے بجلی کی روشنی گل کر دی اور تاریکی میں نہایت اطمینان کے ساتھ اُس کمرے میں پہنچا جہاں سے چھپے ہوئے آدمی نے پچکاری چلائی تھی۔ ابھی اُس شخص کو شاید غور کرنے کی مہلت نہ ملی تھی کہ کپتان اُس کے سر پر موجود تھا۔ کپتان نے اُس کی گردن پکڑ لی اُس کے مُنہ سے ایک خفیف سی چیخ نکلی مگر تین چار منٹ کے بعد وہ زمین پر مُردہ پڑا تھا۔ کپتان اُس کمرے سے باہر نکلا اور زینہ کی طرف چلا مگر اُس کو ایسا معلوم ہوا کہ زینہ پر آٹھ دس آدمی چڑھ رہے ہیں۔ کپتان ایک کواڑ کے پیچھے چھپ گیا آنے والے اوپر آ گئے اُن میں سے جو شخص سب سے آگے تھا اُس نے برقی ٹورچ روشن کر کے چاروں طرف گھمائی اور کہا۔ "مکان تو بالکل خالی معلوم ہوتا ہے"۔ یہ سُنتے ہی

کپتان نے یہ سمجھ لیا کہ یہ لوگ بدمعاشوں میں سے نہیں ہیں۔ کپتان نے ان لوگوں کو اس کمرے میں آنے دیا۔ جب یہ لوگ کمرے کے اندر آ گئے تو وہ چھپے سے باہر نکل آیا اور ساتھ ہی خاموشی کے ساتھ دروازہ بند کر کے باہر سے چٹخنی لگا دی۔ آنے والوں میں سے ایک نے بلند آواز سے پوچھا "کون ہے؟" عباس علی نے جواب دیا۔ "گھبرائیے نہیں آپ بالکل محفوظ ہیں۔"

پہلی آواز۔ جھنجلا کر "تم کون ہو؟ دروازہ کھولو۔"

کپتان۔ نہایت اطمینان سے "یہی سوال میں تم سے پوچھتا ہوں۔"

پہلی آواز۔ میں رحمت اللہ خاں انسپکٹر پولیس ہوں میرے ساتھ سپاہیوں کی گارد ہے دروازہ فوراً کھولو ورنہ تمھاری خیر نہیں۔"

کپتان۔ قہقہہ لگا کر۔ "آخاہ آپ ہیں۔ آپ نے خواہ مخواہ کیوں تکلیف اٹھائی؟"

کپتان نے بجلی کی روشنی کر کے دروازہ کھول دیا۔

انسپکٹر صاحب ندامت میں غرق، غصہ سے بھرے ہوئے، پستول تانے کمرے سے باہر نکلے اور کپتان کو پہچان کر اور زیادہ شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے "ہیں کپتان عباس علی خاں! آپ سے میں نے کئی بار کہہ دیا ہے کہ خواہ مخواہ آپ پولیس کے معاملہ میں دخل نہ دیا کریں۔"

کپتان۔ مسکرا کر "اور میں نے بھی کئی بار جناب کی خدمت میں عرض کر دیا ہے کہ میرے معاملات کو آپ صرف میرے اوپر چھوڑ دیا کریں۔"

انسپکٹر صاحب۔ "خیر۔ اچھا یہ بتاؤ کہ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

کپتان۔ "ابھی تک تو صرف ایک کو مارا۔ ایک کو مرتے دیکھا"۔

انسپکٹر صاحب۔ "یہ کیا ہے؟"

کپتان انسپکٹر صاحب کو اُس کمرے میں لے گیا جہاں اُس نے ابھی ایک شخص کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ خود اُس نے بھی بجلی کی روشنی میں پہلی بار دیکھا کہ اُس مُردہ شخص کے ہاتھوں پر بڑے بڑے ربڑ کے دستانے چڑھے ہوئے تھے اور اُس کے قریب ایک پچکاری پڑی تھی جس کو انسپکٹر صاحب نے حفاظت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد یہ سب لوگ اُس کمرے میں پہنچے جہاں کپتان نے چھت سے لٹکے ہوئے آدمی کو اُتارا تھا وہ شخص اب بھی اسی طرح زمین پر مرا پڑا تھا۔ کپتان نے انسپکٹر صاحب کو وہ سوراخ دکھایا جس میں سے پچکاری چلائی گئی تھی اور تمام واقعہ سمجھا کر کہنے لگا۔

"انسپکٹر صاحب! معاف کیجئے۔ آپ کو اس بات کی تنخواہ ملتی ہے اور میرا یہ ذاتی شغل ہے۔ بہتر ہو گا کہ ہم دونوں اپنے اپنے طریقہ پر اس کام کو جاری رکھیں"۔

انسپکٹر۔ "مگر قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ اس میں مداخلت کریں"۔

کپتان۔ "آپ میری اور قانون کی فکر نہ کریں۔ میں خود قانون کو بھگت لوں گا"۔

انسپکٹر۔ غصہ کو ضبط کر کے۔ "خیر آپ کو اختیار ہے۔ مگر آپ میرے کام میں ہارج نہ ہوں"۔

کپتان:"میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں ہرگز ایسی غلطی نہ کروں گا
لیکن امید ہے کہ آپ بھی اسی طرح میرے معاملہ سے سروکار نہ رکھیں گے"
یہ کہہ کر کپتان انسپکٹر سے رخصت ہونے لگا کہ انسپکٹر نے اُسے پھر
روک کر کہا۔"مگر آپ کی شہادت کی ضرورت ہو گی"
کپتان۔"خدا نہ کرے کہ ایسا وقت آئے"
کپتان رخصت ہوا۔ مگر جانے سے پیشتر اُس نے اچھی طرح مکان کا جائزہ
لے لیا۔ اس کوٹھی کی پشت پر دور تک مکانات کا سلسلہ چلا گیا تھا اور ایک
مکان کی پشت تو اس مکان سے بالکل ملحق تھی۔ کپتان نے اچھی طرح اندازہ
لگایا کہ اس پشت والے مکان کا دروازہ اس سڑک پر ہے جو مٹھائی کے
پل سے سیدھی منڈی کی طرف چلی جاتی ہے +

۴۔ تریاق

اگلے ہی دن کپتان نے ایک ایسا مکان کرایہ پر لے لیا جس کے بالاخانہ
پر سے کوٹھی کی پشت والے مکان کا دروازہ نظر آتا تھا اور علی شیر اور مجھ کو
اس ڈیوٹی پر تعینات کر دیا کہ بالاخانے کے کمرے میں بیٹھے چائے سگریٹ
پیتے رہیں اور تاش و شطرنج سے دل بہلاتے رہیں۔ مگر نظر اُس مکان کے دروازہ
ہی پر رہے۔ تین دن بڑی بے لطفی سے گذرے اور انتظار سے طبیعت
اکتا گئی۔ تیسرے روز کپتان ہم دونوں کو ضروری ہدایات دے کر اُس مکان کے

دروازے پر گیا اور زنجیر کھٹکھٹائی۔ بڑی دیر کے بعد ایک بڑھیا نکل کر آئی اور بغیر دروازہ کھولے ہوئے اندر ہی سے کہنے لگی۔ "بھائی کون ہے؟"

کپتان۔ "بڑی بی! اس مکان میں کون رہتا ہے؟"

بڑی بی۔ "بھائی ہم مصیبت زدہ مسافر ہیں۔ جن بی بی کی میں نوکر ہوں وہ سات مہینے سے بیمار ہیں۔ میاں کو لے کر علاج کرانے آئی تھیں۔ یہ مکان کرایہ پر لیا تھا۔ جانے کس گھڑی گھر سے قدم نکالا تھا، یہاں آتے ہی میاں کو بخار ہوا اور کل صبح گذر گئے۔ اب ہم یہاں بیکس، بے بس پڑے ہیں بی بی نے اپنے بھائی کو کانپور تار دلوایا ہے۔"

کپتان۔ غمگین آواز بنا کر۔ "بڑی بی! آپا سے کہہ دو، میں آگیا ہوں"

بڑی بی نے آہستے سے اندر کی زنجیر کھول کر ذرا سا دروازہ کھولا اور باہر جھانکنے لگی۔

کپتان نے اپنا مضبوط پیر دروازے کے اندر رکھ کر شانے سے ایسا دھکا دیا کہ دروازہ کھل گیا۔ ڈیوڑھی میں علاوہ بڑھیا کے ایک موٹا تازہ جوان نیلی پتلون سفید قمیص پہنے قمیص کی آستینیں چڑھائے ننگے سر پریشان بال جلادوں کی سی شکل ہاتھ میں دو تین شیشیاں لئے کھڑا تھا، کڑک کر بولا۔

"ڈیل! تم کسی کے گھر میں کیوں گھسا آتا ہے؟ نہیں جانتا ہمارا مریض سوتا ہے۔ ابھی اُس کو دوا پلایا ہے۔"

کپتان۔ "حضور ڈاکٹر صاحب! میں تو مریضہ کا سگا بھائی ہوں تار بھیج کر مجھے انہوں نے کانپور سے بلایا ہے۔ ذرا صورت دیکھ لینے دیجئے پھر جو حکم ہوگا بجا لاؤں گا۔"

اِس عجیب الہیئت ڈاکٹر نے ایک لمحہ کے لئے غور کیا پھر بولا "اچھا میرے ساتھ آؤ مگر دیکھو آواز ہونا نہیں مانگتا"۔ کپتان سر جھکائے ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے ہولیا یہ دونوں ایک دالان سے گذر کر ایک زینہ پر چڑھے۔ کپتان بالکل ہشیار تھا اِس لئے وہ جانتا تھا کہ وہ خطرہ میں گھرا ہوا ہے زینہ کے اوپر پہنچ کر کپتان کے ساتھی نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا اور خود باہر ٹھیرا۔ کپتان نہایت ہوشیاری کے ساتھ آگے پیچھے اور اُوپر نیچے کا خیال کرتے ہوئے اُس چھوٹے سے کمرے میں جو کسی قدر تاریک معلوم ہوتا تھا داخل ہوا، مگر مشکل سے چند قدم گیا تھا کہ کمرے کے فرش کا ایک چوکا جس پر وہ کھڑا تھا دفعتہً اُس کے بوجھ سے نیچے جھکا اور زمین سے ایک دروازہ اُٹھا اور کمرے سے باہر نکلنے کا راستہ اُس نے بند کر دیا اب وہ ایک جھولے میں کھڑا تھا جس کمرے میں وہ داخل ہوا تھا۔ اُس میں اب اُس کی گردن اور سر باقی تھا۔ باقی تمام دھڑ کسی نیچے کی منزل کے کمرے میں جھولے کے ساتھ اُتر گیا تھا۔ وہ اُچک کر اُوپر نہیں پہنچ سکتا تھا نیچے کے متعلق اُسے علم نہ تھا کہ کنواں ہے یا کھائی وہ آہستہ آہستہ جھولے پر بیٹھ گیا۔ اندر خوفناک تاریکی تھی۔ اتفاقاً اُس کی جیب میں ایک دیا سلائی کا بکس موجود تھا۔ اُس نے دیا سلائی جلا کر اُس تہ خانہ کا معائنہ کرنا چاہا۔ دو تین دیا سلائیاں جلانے کے بعد معلوم ہوا کہ اُس کال کوٹھری کی تہ جھولے سے چھ سات فٹ کے قریب نیچی ہے۔ ذرا دیر تامل کے بعد کپتان نے یہی فیصلہ کیا کہ اس پھانسی کے تختے پر لٹکے رہنے سے کھائی میں گرنا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ وہ احتیاط سے اُس کے اندر کود گیا۔ جھولے کا تختہ پھر اپنی جگہ

چھت پر جا لگا اور ایک دروازہ کمرے کے اندر دیوار کے برابر اُتر آیا۔ فرش پر کیچڑ سی محسوس کر کے کپتان کو بڑا تعجب ہوا۔ کپتان نے پھر دیا سلائی جلائی تو معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑا خون کا چھکا ہے جو سورج کی روشنی نہ پہنچنے کی وجہ سے خشک نہ ہوا تھا۔ تاہم یہ خون کسی طرح چار پانچ روز سے زیادہ پرانا نہ تھا کمرے کی ہوا اس قدر غلیظ تھی کہ کپتان کا سر چکرانے لگا۔ اُس نے اپنے پنجوں پر کھڑے ہو کر جھولے کو پھر نیچے کھینچنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ اس طرح بند ہو گیا تھا کہ اب اُس کا کھولنا نا ممکن تھا۔ کپتان کو خیال ہوا کہ شاید اُس نے جھولے سے نیچے کودنے میں بڑی سخت غلطی کی۔ بہر حال دیا سلائی جلا کر کمرے کی دیوار اور فرش کو حتی الامکان غور سے دیکھا۔ اُس کو فرش کے اندر دو اینٹیں اُکھڑی ہوئی معلوم ہوئیں جن کو بآسانی اُس نے ہاتھ سے اوپر اٹھا لیا اور اندر ہاتھ ڈالا تو ایک چار اونس کی گول شیشی ایک کاغذ کے پرچے میں لپٹی ہوئی ہاتھ آئی۔ اُس نے پھر دیا سلائی جلائی۔ پرچے پر لکھا تھا "میرے تیار کردہ زہر کا تریاق۔ ایم۔ ڈی۔"

کپتان ابھی مصروف ہی تھا کہ دفعتہً کسی نے دیوار کی دوسری طرف کوئی چیز زور زور سے دیوار پر ماری۔ تھوڑے سے وقفہ کے بعد پھر ایسا ہی ہوا مگر تھوڑی دور ہٹ کر۔ کپتان نے سمجھا کہ یقیناً یہ کسی قسم کا سگنل ہے اور اُس کے جواب میں جس قدر زور سے ممکن تھا اُس نے بھی دیوار پر مکّے لگائے۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شخص دیوار اُدھر سے کھود رہا ہے تقریباً چار پانچ منٹ گزرنے پر ایک سوراخ ہو گیا۔ کپتان نے سوراخ کے قریب

منہ کر کے کہا "شاباش" دوسری طرف سے علی شیر کی آواز سنائی دی "کپتان"۔

۵۔ عزمِ سفر

کپتان کی کوٹھی پر علی شیر اور میں شام کے وقت پھر پہنچے۔ ہاں مگر میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ ہم نے کس طرح کپتان کو تاریک قید خانہ سے نجات دلائی۔ جاتے ہوئے کپتان ہم سے یہ کہہ گیا تھا کہ اگر کسی قسم کا شبہ تم کو پیدا ہو اور مجھے واپسی میں دیر لگے تو بجائے اس مشتبہ گھر میں داخل ہونے کے اُس پشت والی غیر آباد کوٹھی میں چلے جانا جہاں اس سے پیشتر کپتان اور انسپکٹر کی ملاقات ہوئی تھی اور اُس مکان سے اِس مکان میں آنے کی کوشش کرنا چنانچہ جب کپتان کو اِس مکان کے اندر گئے ہوئے پندرہ بیس منٹ گذر چکے اور مکان کے دروازے پر ایک بند گاڑی آئی جس میں کئی بھاری بکس رکھے گئے اور کئی آدمی اُس پر سوار ہو کر چلے گئے تو تشویش پیدا ہوئی حسبِ ہدایت کپتان ہم کوٹھی کے اندر گئے اور پشت کی طرف سے مکان میں داخل ہونے کا راستہ ڈھونڈنے لگے۔ پشت کی دیوار میں ہمیں ایک ڈاٹ تیغہ کی ہوئی نظر آئی جس کی چنائی بہ نسبت اِدھر اُدھر کی دیوار کے بہت نئی معلوم ہوتی تھی۔ اِس لئے ہم نے چاہا کہ یہ نئی دیوار توڑ کر راستہ نکالیں چنانچہ جب ہم نے اس کو کھودنا شروع کیا تو دوسری طرف سے جواب میں دھماکے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر کے لئے تو ہم ٹھیر کر یہ سوچنے لگے کہ کیا کرنا

چاہئے۔ مگر تامل کا وقت نہ تھا، اِس لئے پھر کھودنے لگے۔ خوش قسمتی سے چنائی ایک ہی اینٹ کی تھی اِس لئے بہت جلد سوراخ ہوگیا اور کپتان کی آواز سُن کر ہم بہت خوش ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کپتان کو ساتھ لے کر پھر اُس مکان کے دروازے پر آئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو کسی نے جواب نہیں دیا لیکن دروازہ کھُلا پاکر ہم مکان کے اندر گئے اور مکان کا کونا کونا چھان مارا، کوئی شخص نہیں ملا، مگر ایک گوشہ میں ایک جاذب کا ٹکڑا دستیاب ہوا، جو کپتان نے بہ حفاظت اپنے پاس رکھ لیا۔ اب ہم کپتان کے پاس اِس لئے آئے تھے کہ آئندہ کا پروگرام بنائیں۔ علی شیر اپنے دوست ڈاکٹر مجیب الدین کے لئے بہت بے چین تھے۔ اُس وقت کپتان نے ہمیں وہ بلاٹنگ کا ٹکڑا ایک آئینہ کے سامنے رکھ کر دکھایا۔ اگرچہ بہت سے نقوش ایک دوسرے پر آئے ہوئے تھے، لیکن بہرام پور صاف پڑھا جاتا تھا۔ علی شیر نے کڑک کر کہا، "پھر اِس سے تمھاری غرض؟" کپتان نے نہایت متانت سے جواب دیا "یہی اِس رازِ سربستہ کی کنجی ہے۔"

کپتان کو کال کوٹھری میں جو شیشی ملی تھی وہ اُس نے علی شیر کو دکھائی علی شیر نے تسلیم کیا کہ اس کے ساتھ جو پرچہ تھا اُس پر ڈاکٹر مجیب الدین کی تحریر اور دستخط تھے اُس کی پشت پر ایک سُرخ خون کا دھبّہ تھا جس کو بغور دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُنگلی کو خون میں ڈبو کر بہرام لکھنے کی کوشش کی گئی تھی کم از کم کپتان کا یہ خیال تھا۔ اگرچہ میں اور علی شیر اس کو محض وہم سمجھتے تھے۔ علی شیر نے پھر پوچھا کہ "یہ مقام کس جگہ ہے؟" کپتان۔ "اِس نام کے

کئی شہر ہیں مگر یہاں مُراد وہ بہرام پور ہے جو کلکتہ سے جنوب کی طرف ساحلِ سمندر پر واقع ہے اور ممنوع منشیات کی مجرمانہ درآمد کے لئے بدنام ہے "

علی شبیر - " مگر اس کی دلیل "

کپتان - " دلیل ابھی کچھ نہیں بتاتا - واقعات خود ہی میرے اس بیان کی دلیل پیش کر دیں گے - بس اب ہماری جد و جہد کا میدان بدل جانا چاہیئے اور آج ہی ہم تینوں رات کی گاڑی سے کلکتہ روانہ ہو جائیں گے راجپال سنگھ یہاں ہیڈ آفس کا انچارج رہے گا - وہاں کی مختصر خبریں ہم اس کو یہاں بھیجتے رہیں گے اور یہاں کے حالات سے وہ ہمیں مطلع کرتا رہے گا "

اُسی روز رات کو دہلی سے ہم روانہ ہوئے - اگلے دن دس بجے کے قریب بنارس کے اسٹیشن پر ہم نے دو تین روزانہ اخبار خریدے - اُن میں سے ایک انگریزی اخبار میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ چھپا تھا جسے کپتان نے زور زور سے پڑھ کر سنایا اور ہمارے کمپارٹمنٹ میں جتنے مسافر تھے سب بے حد محظوظ ہوئے - واقعہ یوں تھا :-

" کچھ عرصہ ہوا امریکہ کے مشہور ارب پتی تاجرِ فولاد مسٹر کلیفرڈ نے چار لاکھ پونڈ میں موتیوں کی ایک مالا اپنی بیوی کے لئے خریدی - اس مالا کے متعلق ایک مشہور روایت چلی آتی تھی - کسی قدیم زمانہ میں یہ مالا جزائرِ شرق الہند کے ایک غیر معروف جزیرے سے ایک جہاز کا کپتان لایا تھا اُس وقت سے یہ مالا سینکڑوں بار بکی - ہمیشہ اس کی قیمت بڑھتی رہی مگر جب

گھر میں پہنچی اُس کو بالکل برباد کر دیا۔ نہ دولت باقی چھوڑی اور نہ جانیں، حیرت تو یہ ہے کہ لوگ اس کی نحوست کے قائل ہو چکے تھے لیکن دولتمند اُس کے حسن پر ایسے فریفتہ ہوتے ہیں کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اس کی نحوست کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اس کو خرید لیتے ہیں۔ جس وقت کلیفرڈ نے اُس کو خریدا دولت و ثروت اُس کے قدموں میں لوٹتی تھی اور لوگ اس کی خوش قسمتی کی قسم کھاتے تھے۔ اُس کی تیسری بیوی نہایت حسین مگر پرلے درجے کی ضدی تھی۔ اس مالا کے خریدنے کی اُس کو کچھ ایسی ضد چڑھی کہ کلیفرڈ انکار نہ کر سکا اس کو خریدنے کے چند روز بعد کلیفرڈ کی بیوی نے ایک چھوٹا سا خوب صورت جہاز خریدا۔ عیش و عشرت کی ہر وہ چیز جو دولت خرید سکتی ہے خریدی گئی اور اس جہاز میں پہنچا دی گئی۔ اس کے بعد مسٹر کلیفرڈ نے امریکہ کے ایک درجن ارب پتی سوداگروں اور اُن کی بیویوں کو دنیا کے گرد بحری سفر اور تفریحی سیاحت کی دعوت دی۔ اب سے ایک مہینہ پیشتر یہ جہاز نیویارک کی بندرگاہ سے روانہ ہوا اور لندن، مارسیلز، روم، قسطنطنیہ عدن ہوتا ہوا یمن آیا اور وہاں سے چل کر کولمبو ہوتا ہوا سنگاپور جا رہا تھا۔ کولمبو سے روانہ ہونے تک ہر آدھ گھنٹہ کے بعد لاسلکی پیغامات کلیفرڈ کے صدر دفتر واقع شکاگو کو پہنچتے رہے۔ آخری خبر دفتر ہذا میں یہ موصول ہوئی کہ ہمارے جہاز پر کچھ دیر سے ایک چھوٹا زیپلین نما ہوائی جہاز چکر کاٹ رہا ہے اور جہاز کی تمام خواتین عرشہ جہاز پر جو بالکل کھلا ہوا ہے جمع ہو گئی ہیں۔ اس خبر کے بعد سلسلۂ پیغامات دفعتہً منقطع ہو گیا۔ ہندوستان کے ساحل پر جس قدر

سول یا ملٹری وائرلیس اسٹیشن واقع ہیں اُن سب کو پیغام بھیجا گیا کہ جہاز سے سلسلۂ پیغامات منقطع ہونا ظاہر کرتا ہے کہ جہاز کسی شدید خطرہ میں گرفتار ہو گیا ہے۔ فوراً اس جہاز کی تلاش کے لئے بے شمار کشتیاں اور جہاز روانہ ہوئے اور اُنہوں نے خلیج بنگال کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا۔ صرف ایک جہاز نے یہ خبر دی کہ بروئے حساب انقطاع پیغام ہوائی کے وقت جس جگہ جہاز کو ہونا چاہئے تھا وہاں اُس نے ایک جہاز کو ڈوبتے دیکھا تھا۔ اور ایک عجیب منظر یہ نظر آیا تھا کہ ایک طیّارہ اس جہاز کے اُوپر ہوا میں قائم تھا اور ایک رسّی کی سیڑھی سے اس جہاز کے ساتھ وابستہ تھا اور کچھ لوگ تیزی کے ساتھ اس رسّی کے زینہ کے ذریعہ تختۂ جہاز سے طیّارہ پر چڑھ رہے ہیں۔ تختۂ جہاز پر بڑی کثرت سے لوگ مرے ہوئے تھے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جہاز کے اندر ایک زبردست دھماکہ ہوا اور جہاز غرق ہو گیا اِس طیّارہ کی بے حد تلاش ہو رہی ہے مگر ہنوز کچھ سُراغ نہیں ملا"۔

کپتان نے پڑھنا ختم کیا تو سننے والے باہم اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے مگر کپتان نے نہایت احتیاط سے اس خبر کو، اخبار میں سے علیحدہ کر کے اپنی نوٹ بک کے اندر رکھ لیا۔ کپتان نے اس اخبار میں ایک اور بھی خبر دیکھی جس کو اُس کے تیز فہم دماغ نے نہایت تیزی اور آسانی سے مندرجہ بالا واقعہ اور ڈاکٹر مجیب الدین کے معاملہ سے مربوط کر لیا وہ خبر یہ تھی :۔

"کچھ عرصہ ہوا جنوبی افریقہ کے متمول ترین تاجر مسٹر نیوٹن وہاں اپنا

کاروبار بند کر کے اپنے وطن کلکتہ چلے آئے ہیں اور اُنہوں نے موضع بہرام پور
خرید کر ایک عالیشان مکان اپنی بود و باش کے لئے تعمیر کیا ہے۔ مکان کے
قریب ہی ایک وسیع میدان میں ایروڈروم بنایا ہے ان کو ہوابازی سے نہایت
درجہ دلچسپی ہے۔ اُنہوں نے ایک بہت خوب صورت زپلین نما ہوائی جہاز خریدا
ہے، اور بنگال میں ہوائی سفر کو مقبولیتِ عام دینے کے لئے اُنہوں نے یہ طریقہ
اختیار کیا ہے کہ ہر اتوار کو وہ کلکتہ کے اکثر لوگوں کو ہوائی سیر کی دعوت دیتے ہیں۔ یعنی
سب لوگوں کو اس ہوائی جہاز میں بٹھا کر کلکتہ کے گرد و نواح کی سیر کراتے ہیں
اور ہوا میں سفر کرتے ہوئے اپنے ہوائی جہاز کے وسیع ڈرائنگ روم میں
اپنے مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ یہ جہاز اتنا بڑا ہے کہ بیک وقت پچاس آدمی
نہایت آسائش سے اُس میں سفر کر سکتے ہیں۔ روزانہ یہ جہاز کرایہ پر مسافروں
کو بنگال کے مختلف شہروں میں لے جاتا ہے۔ کرایہ کا نرخ بھی بہت ہی کم ہے
نیوٹن صاحب کا خیال ہے کہ اگر لوگوں کی جھجک دور ہوگئی تو وہ ایسے جہازوں کی
کافی تعداد خرید کر اُن کو بنگال میں کرایہ پر چلائیں گے اور اس طرح ایک نہایت تیز
رفتار، ارزاں اور معقول سروس قائم ہو جائے گی۔ فی الحال حکومت بھی اِس
تحریک کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ کر نیوٹن صاحب کی بہت ہمت افزائی
کر رہی ہے اور اُن کی بدولت اُنہوں نے چند ہی روز میں تمام حکّام کے حلقہ
میں ایک زبردست اقتدار اور اثر جما لیا ہے۔ حکومت نے اُن کو حال ہی میں ایک
کان کنی کا ٹھیکہ بھی دیا ہے۔ سمندر کے کنارے بہرام پور سے سات آٹھ میل
کے فاصلہ پر مشرق کی طرف انہوں نے ایک کوئلہ کی کان دریافت کی ہے اِس

کان سے پہلے کوئلہ نکالا جاچکا ہے اور حکومت کے انجنیروں نے یہ فیصلہ کرکے اُس کو چھوڑ دیا تھا کہ اس قدر کھدائی اس میں ہو چکی ہے کہ مزید کھدائی سے کوئلہ نکالنے کی لاگت بازار کے نرخ سے بھی زیادہ پڑے گی، مگر نیوٹن صاحب نے اپنے ایک امریکن انجنیر کے مشورے سے اس کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔"

کپتان نے اِس خبر کو بھی اخبار سے کاٹ کر اپنی نوٹ بک میں محفوظ کیا۔ کلکتہ پہنچ کر ہم سب کپتان کے ایک پُرانے دوست کریم الدین خاں رئیس کریم نگر کے مکان پر کریم نگر ہی میں فروکش ہوئے۔ کریم نگر کلکتہ کے مضافات میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو حسنِ اتفاق سے بہرام پور سے صرف دو مِیل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

بہرام پور پہنچتے ہی کپتان نے اپنا کام شروع کر دیا مگر اِس قدر خاموشی سے کہ اُن کے ساتھی یہی خیال کرتے رہے کہ وقت کھانے پینے، ہنسنے بولنے اور سیر کرنے میں ضائع ہو رہا ہے اور آخر تیسرے روز علی شیر کپتان پر بہت برہم ہوئے۔ کپتان نے اس وقت تو ہنس کر ٹال دیا لیکن اسی روز رات کو گیارہ بجے کے بعد کپتان نے ہم دونوں سے کہا کہ "تیار ہو جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔" ہم بے چون وچرا کپتان کے ساتھ ہو لئے۔ گھنٹہ بھر تک ایک پختہ سڑک پر درختوں کے سائے میں چلتے رہے۔ رات اندھیری تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہَوا تک بند تھی۔ پتہ تک کھڑکتا تو دل ہلنے لگتا تھا۔ آخر سڑک کو چھوڑ کر ہم کپتان کے پیچھے پیچھے داہنے ہاتھ کی طرف ایک پگڈنڈی پر ہو لئے جو کسی قدر بلندی پر چڑھتی تھی۔ دفعتہً کپتان

رک گیا اور ہاتھ کے اشارے سے اُس نے ہم دونوں کو بھی روکا۔ ہم نے غور سے دیکھا تو دو درختوں کے بیچ میں ایک رسّی تنی ہوئی تھی اور اگر کپتان اس قدر محتاط نہ ہوتا تو ہم دونوں اُس میں اُلجھ کر مُنہ کے بل گرتے مگر یہ انسانی جال دیکھ کر ہمیں سخت تشویش پیدا ہوئی کیونکہ یہ یقین ہو گیا کہ رسّی کا محافظ ضرور کہیں قریب ہی ہوگا۔ کپتان نے ہمیں تو وہیں کھڑا رہنے کی تاکید کر دی اور خود وہ ایک لمحہ کے لئے تاریکی میں غائب ہو گیا +

دو تین منٹ کا وقفہ گذرا ہوگا کہ کپتان نے پیچھے سے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شاید میری چیخ نکل جاتی اگر کپتان بول نہ پڑتا۔

اچھا یہاں سے تو فراغت ہوئی، اب آگے چلنا چاہئے۔ یہاں کے دونوں محافظوں کو تو میں نے ٹھکانے لگا دیا اب "۔

"ہیں! کیا مار ڈالا؟"۔

"نہیں صرف بیہوش کر دیا۔ صبح تک آرام سے سوتے رہیں گے"۔

اس کے بعد دیر تک گفتگو نہیں ہوئی اور ہم خاموشی کے ساتھ کپتان کے پیچھے دو تین میل چلے گئے۔ پھر ایک ٹیلے پر چڑھے اور کچھ دور چل کر گنجان جھاڑیوں کے قریب رُکے اور کپتان کے اشارے پر ہم تینوں زمین پر بیٹھ گئے۔ اس وقت آہستہ آہستہ بادل پھٹ رہے تھے اور بہت دُور سے کوّوں اور بحری چڑیوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگی تھیں جس سے ہم نے سمجھا کہ صبح ہونے والی ہے۔ تاریکی بھی دُور ہو چلی تھی۔ جس جگہ ہم بیٹھے ہوئے

تھے، وہاں سے دریائے ہگلی کا کنارہ مشکل سے نصف فرلانگ کے فاصلہ پر تھا مگر ساحل اس جگہ ایک قوس کی شکل میں پھیلا ہوا تھا اور بالکل غیر آباد معلوم ہوتا تھا۔ بائیں ہاتھ کی طرف تقریباً سَو گز دُور ایک پتھر کی لاٹ ایک ٹیلے پر نصب تھی۔ کپتان خاموشی اور سکون کے ساتھ کسی خاص واقعہ کا منتظر تھا۔ دفعتہً آسمان سے گھوں گھوں کی آواز آئی اور کپتان کی ہدایت کے مطابق ہم تینوں زمین پر لیٹ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک غبارہ نما طیارہ آسمان پر منڈلا رہا ہے اور نیچے اُترنے کی کوشش کر رہا ہے۔ نیچے ہوتے ہوتے غبارے نے اپنا لنگر سنگین لاٹ پر پھینکا پھر ایک رسی کی سیڑھی لٹکائی جس سے ایک آدمی نیچے اُترا اور اُس نے لنگر کی رسّی مضبوطی کے ساتھ لاٹ سے باندھ دی، اوپر سے جہاز والوں نے کچھ ربڑ کے موٹے موٹے نل جہاز کے نیچے لٹکائے جن کو نیچے والے آدمی نے ایک بہت بڑے حوض کے اندر جو اس لاٹ کے قریب بنا ہوا تھا ڈال دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد ربڑ کے نل مشین کے ذریعہ سے جہاز کے اوپر کھینچ لئے گئے۔ اور نیچے والے آدمی نے رسّی کی سیڑھی پر چڑھ کر لنگر کی رسی کھول دی اور خود اوپر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد طیارہ نظر سے اوجھل ہوگیا اور ہم اپنی کمیں گاہ سے نکل کر اس طرف چلے جہاں پتھر کی لاٹ نصب تھی۔ راستہ بالکل ناہموار اور سخت دشوار گذار تھا۔ ہماری رہبری کے لئے نہ کوئی پٹیا تھی نہ اور کوئی راستہ کا نشان تھا۔ بلکہ ہمیں چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیوں کے بیچ میں سے گذرنا پڑا۔ جس سے ہمارے کپڑے بھی پھٹ گئے اور بارہا ہمارے پیر اور ٹانگیں زخمی ہوئیں۔ مگر

وقت نہایت سہانا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ صبح کی دھندلی
روشنی میں دریا کا منظر نہایت دلفریب معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں اپنے کام میں
ایک عجیب دلچسپی اور دل میں ایک ایسی فرحت محسوس ہو رہی تھی جو ایک تھکے
ماندے مسافر کو اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے سے کچھ دیر پیشتر محسوس ہونے لگتی
ہے۔ طلوعِ آفتاب میں ابھی ایک گھنٹہ کی دیر تھی کہ ہم لاٹ کے قریب
جا پہنچے اور اس حوض کو دیکھا جس میں ربڑ کے نل ڈالے گئے تھے یہ نو دس
گز لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ گہرائی بھی بہت کافی معلوم ہوتی تھی۔ اس میں
سیاہی مائل سُرخ رنگ کا سیّال مادہ بھرا ہوا تھا۔ ہم اس حوض کے گرد
گھوم کر دوسری طرف گئے اور کئی سنگین سیڑھیوں سے نیچے اُترے۔ چند
قدم کے فاصلہ پر ایک بلند دیوار نظر آئی جو دُور تک چلی گئی تھی۔ زینہ کے بالکل
سامنے اس دیوار میں ایک مضبوط پھاٹک لگا ہوا تھا جو اس وقت اندر سے
بند تھا۔ کپتان ایک رسّی کے ذریعہ سے دروازہ پر چڑھ کر نہایت خاموشی
کے ساتھ دیوار کی دوسری طرف کود گیا اور دروازہ کھول دیا۔ میں اور
علی شیر اندر گئے۔ دو آدمی جو غالباً چوکیدار تھے ایک تخت پر پڑے سو رہے
تھے۔ ہم تینوں نے مل کر اُن کو رسّیوں سے جکڑ دیا۔ اُنہوں نے آزاد ہونے
کی جان توڑ کر کوشش کی لیکن بالکل بے بس ہو چکے تھے اور مُنہ میں کپڑا
ٹھُسا ہوا تھا اس لئے چیخ چلا کر بھی مدد طلب نہ کر سکتے تھے۔ اس کے بعد
ہم آگے بڑھے اور ایک مختصر باغیچے سے گذر کر ایک چھوٹی سی کوٹھی کے
قریب جا پہنچے۔ ہم نے درختوں کے پیچھے کھڑے ہو کر دیکھا کہ ایک شخص سفید

سوٹ پہنے ہوئے ننگے سر، بال پریشان کوٹھی سے نکل کر سامنے کی روش پر ٹہلنے لگا۔ علی شیر نے اُس طرف بھاگنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ کپتان نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ علی شیر نے کہا "ڈاکٹر مجیب الدین" کپتان نے علی شیر کو بولنے سے بھی روک دیا۔

ڈاکٹر مجیب الدین کے چہرے اور دوسری مجنونانہ حرکات سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھے۔ کبھی زیر لب کچھ بڑبڑاتے تھے اور کبھی زور زور سے کہتے تھے "مار ڈالوں گا۔ ہزاروں کو لاکھوں کو کروڑوں کو چند قطروں سے۔ آسمان سے بادلوں سے موت کا مینہ برساؤں گا۔ ظالم برباد۔ میرا کیا بگاڑ سکتے ہو (قہقہہ) دھوکہ صاف دھوکہ۔ چبا جاؤں گا، کھا جاؤں گا، نگل جاؤں گا!"

ہم نے ڈاکٹر کو یہیں چھوڑا اور چکر کاٹ کر پشت کی طرف سے کوٹھی میں داخل ہوئے اور ڈاکٹر کے سونے کے کمرے میں گئے۔ ایک نواڑی پلنگ پر بچھونا بچھا ہوا تھا، تکیے بے ترتیبی سے پڑے تھے، کمرہ ہر قسم کے ساز و سامان سے خالی تھا۔ صرف ایک میز پر قلم دوات رکھی تھی اور بہت سے کاغذ کچھ لکھے ہوئے اور کچھ بغیر لکھے پڑے تھے۔ کپتان نے اُن کو اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا کوٹھی سے ہم باہر نکلے اور کوٹھی کے احاطہ کے جس دروازے سے آئے تھے اُسی طرف چل دئے۔

جب دروازے کے قریب پہنچے تو ہمیں ایک اصطبل نما شیڈ نظر آیا جس پر ٹین کی ڈھلواں چھت پڑی تھی۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اُس کا فرش

اِدھر اُدھر کی زمین سے کئی فٹ نیچا تھا۔ اور سیڑھیوں کے ذریعہ سے اُس کے اندر اُتر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم اُس کے اندر گئے۔ اُس کی پشت کی طرف بڑی احاطے کی دیوار تھی، اور اُس دیوار میں دو بہت بڑے براس کا رک لگے ہوئے تھے۔ اس کمرے کا فرش پختہ تھا اور وسط میں ایک بڑی میز پڑی تھی جس پر دو بہت بڑی بڑی کتابیں رکھی تھیں۔ میز کے گرد کوئی کرسی نہیں تھی، اس لئے ہم سب اُس میز سے سہارا لگا کر کھڑے ہو گئے اور کپتان نے جو کاغذات ڈاکٹر مجیب الدین کی میز پر سے اُٹھائے تھے اُن کو جیب سے نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ یہ ایک لمبی چوڑی تحریر تھی جس کا ابتدائی حصہ ایک کاپی پر لکھا ہوا تھا اور عبارت بھی زیادہ مربوط، بامعنی اور مسلسل تھی، مگر اُس کا آخری حصہ جو مختلف کاغذوں پر لکھا ہوا تھا نہایت غیر مربوط عبارت پر مشتمل تھا۔ بہت سا حصہ بالکل بے معنی تھا۔ مگر تمام تحریر خوش قسمتی سے بہت خوش خط لکھی ہوئی تھی اور صاف پڑھی جاتی تھی۔ کپتان نے ابتدائی حصہ پڑھنا شروع کیا۔

"آج مجھے جب ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک سنسان مقام میں پایا جہاں بجز چند بدمعاشوں کے جو میری نگرانی پر متعین ہیں کوئی اور شخص نظر نہیں آیا۔ میں ایک پلنگ پر لیٹا تھا جب میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو مجھے اپنے پشتِ سر میں تکلیف محسوس ہوئی اور ضعف سے سر چکرانے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ تکلیف مجھے اُس چوٹ کی وجہ سے ہے جو اُس رات کو میں نے کھائی تھی، جب یہ بدمعاش مجھے میرے گھر سے بیہوش کر کے لے گئے تھے اور پھر اُس تاریک کوٹھی میں مجھے قید کیا تھا جہاں میں نے اپنے دریافت کردہ

زہر کا تریاق زمین کھود کر چھپا دیا تھا۔ ہاں مجھے یاد آیا کہ میرے متعلق بہرام پور لے جانے کی صلاح تھی۔ ممکن ہے کہ یہ مقام بہرام پور ہی ہو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ بہرام پور ہندوستان کے کس حصہ میں واقع ہے۔ میں چند روز میں دریافت کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرا دل گھبراتا ہے اور دماغ پوری طرح کام نہیں کرتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ظالموں نے میری درخواست منظور کر لی اور مجھے لکھنے پڑھنے کا سامان دے دیا۔ شاید اسی طرح کچھ دل بہلے۔ اچھا ان لوگوں کو جو میری مرضی کے خلاف مجھے یہاں اٹھا لائے ہیں مجھ سے کیوں دشمنی ہے؟ ہاں مجھے یاد آیا آسٹریلین تاجر براڈریج جو مجھے ایک بہت بڑی رقم دے کر اس بات پر آمادہ کر رہا تھا کہ میں زہر اور اس کے تریاق کا راز اپنی حکومت کو بتانے کی بجائے اس کو بتا دوں۔ اپنی آخری ملاقات میں مجھے اس نے اپنے ان خوفناک اور وحشیانہ ارادوں کے متعلق بتایا تھا جو اس میری ایجاد کے ذریعہ سے وہ پورے کرنا چاہتا ہے۔ ہاں اور میں نے صاف انکار کر دیا تو اس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کپتان عباس علی خاں نے ابھی یہیں تک پڑھا تھا کہ اس نے دفعتہً مڑ کر دیکھا۔ اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور وہ کود کر منبر پر چڑھ گیا اس کے اشارے اور چلانے پر ہم بھی منبر پر چڑھ گئے۔ اب ہم نے دیکھا کہ کمرے میں چاروں طرف ایک سیاہی مائل سرخ سیال مادہ بہ رہا ہے اور بہتے بہتے منبر کے بالکل قریب آ گیا ہے۔ پشت کی دیوار میں جو نل لگے ہوئے تھے وہ پورے کھلے ہوئے تھے اور ان میں سے یہ رقیق مادہ تیزی کے ساتھ

نکل رہا تھا۔ ہمارے میز پر چڑھتے ہی یہ سیلاب میز کے نیچے بھی پھیل گیا مگر ہم اس وقت تک میز پر چڑھ جانے کا مطلب ذرا بھی نہ سمجھے جب تک کپتان نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ یہ سیلاب اس حوض سے آرہا ہے جو ٹیلے پر سنگین لاٹ کے قریب بنا ہوا ہے اور فی الحقیقت یہ ڈاکٹر مجیب الدین کا ایجاد کردہ زہر ہلاہل ہے جس کا ایک قطرہ جسم کے کسی حصہ سے چھو جانا یقینی موت کا باعث ہے اب ہم نے اپنی مصیبت کا صحیح اندازہ کیا۔ کمرہ زیر زمین تھا اور میز کی اونچائی کمرے کی باہر کی زمین سے کم تھی۔ سیلاب برابر زمین سے بلند ہو رہا تھا اور اس قدر تیزی سے یہ رقیق مادہ آرہا تھا کہ مشکل سے دس منٹ گزرنے پائیں گے جبکہ میز بھی ڈوب جائے گی۔ یقینی موت ہمارے سامنے کھڑی تھی اور ہم ایسے بے بس تھے کہ ہاتھ پیر بھی نہ ہلا سکتے تھے۔ ہم تینوں پر ایک سکتہ کا عالم طاری تھا اور ہم قطعی بھول چکے تھے کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں اور صرف ایک ہی خیال ہمارے دل میں گونج رہا تھا اور وہ موت کا خیال تھا۔ انتہائی بے بسی اور بیچارگی کی موت۔

آخر رقیق زہر کی سطح میز کے تختہ سے بمشکل تین انچ رہ گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس روحانی اذیت کے مقابلہ میں جو اس وقت دل کو پہنچ رہی تھی میرا تو یہ جی چاہتا تھا کہ ہمت کر کے اس سیلاب میں کود پڑوں تاکہ فوراً خاتمہ ہو جائے۔ تمام بدن میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا اور قریب تھا کہ گر پڑوں۔ مگر کپتان نے مجھے سنبھالا۔ اس وقت میرے کان میں ایک قہقہہ کی آواز آئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جان نکلنے سے پہلے کوئی دوزخ

کا فرشتہ ہمارے استقبال کے لئے آموجود ہوا اور ہماری اِس مصیبت پر خوش ہو رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں تو دیکھا کہ دروازے پر ایک شخص کھڑا ہے۔ سر سے پیر تک ربڑ کی وردی پہنے ہوئے ہے۔ ہاتھوں میں بھی بڑے بڑے ربڑ کے دستانے چڑھائے ہوئے ہیں۔ صرف منہ کھلا ہوا ہے میں نے ڈاکٹر مجیب الدین کو پہچان لیا جو خوش ہو ہو کر کہہ رہا تھا۔ "دیکھا مجھے قید کرنے کا مزہ! آج کیسا پھنسا یا ہے۔ بس آج میرا زہر تمھارا خاتمہ کر دے گا مار ڈالوں گا، جلا دوں گا، خاک کر دوں گا۔ ہاں اسی طرح میرا زہر تمام قوموں کو برباد کر دے گا، دنیا ظالموں سے پاک ہو جائے گی، پھر ساری دنیا میں میرا راج ہوگا، سچائی کا راج ہوگا۔"

ڈاکٹر جوش میں آ کر بار بار اپنے دونوں ہاتھ بلند کرتا تھا۔ علی شیر نے کئی دفعہ پکار پکار کر کہا "ڈاکٹر صاحب! میں ہوں تمھارا دوست علی شیر" تو ڈاکٹر نے مکّے بنا بنا کر اُس کی طرف دکھائے اور ہم نے سمجھ لیا کہ ڈاکٹر کا جنون اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اب وہ دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کر سکتا۔ کچھ دیر کے لئے ہماری توجہ اس طرف منعطف ہو گئی اور ہم اپنی موت کے یقینی سبب کو ایک لحظہ کے لئے بھلا بیٹھے، مگر دفعتہً کپتان کے قہقہہ نے ہمیں چونکا دیا اور میں اس خیال سے کانپ اٹھا کہ شاید اس مصیبت نے کپتان کو بھی مجنوں بنا دیا ...... "ہنسی کا یہ کون سا موقع اور محل ہے جب کہ موت سر پر کھیل رہی ہے"۔ علی شیر نے جھنجلا کر کپتان کو ڈانٹا۔ کپتان نے نہایت سکون اور متانت سے کہا۔ "صاحبزادو! چلو خیر گذری، مرتے مرتے بچے"۔

علی شیر۔ "وہ کیسے ہ؟"

"وہ دیکھو نل خشک ہوگیا۔ زہر اُس میں سے نکلنا بند ہوگیا ہماری خوش قسمتی سے آج صبح ہی اِس زہر کا بہت سا حصہ کنور سین نے اپنے ہوائی جہاز پر کھینچ لیا تھا، ہماری زندگی تھی جو نچ گئے"۔

علی شیر۔ "زہر آنا تو بند ہوگیا مگر اس حوض میں سے اب باہر کیسے نکلیں گے؟"

ابھی کپتان نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ ڈاکٹر نے بھی محسوس کر لیا کہ اب اُوپر والے حوض کا زہر ختم ہو چکا ہے اور یہ لوگ اُس کے اندر ڈوب نہیں سکتے۔ خدا جانے اُسے کیا سوجھی کہ بھاگتا ہوا ایک طرف گیا اور ایک روشندان کے ذریعہ سے دو موٹے موٹے ربڑ کے پائپ کمرے کے اندر لٹکائے حتیٰ کہ اُن کے سرے زہر میں ڈوب گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم نے محسوس کیا کہ یہ دونوں پائپ زہر کو چوس کر اُوپر لے جا رہے ہیں۔ دس منٹ میں تمام کمرہ خشک ہوگیا اور فرش کے چند گڑھوں اور ریخوں میں کچھ قطرات باقی رہ گئے اور نمی تمام فرش پر باقی رہی۔ میز سے نیچے اُترنا اب بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ کپتان نے بلا تامل جیب سے رسی نکال کر وہ دونوں کتابیں جو میز پر پڑی تھیں اپنے جوتوں کے نیچے باندھ لیں اور آہستگی سے میز سے نیچے اُتر گیا۔ چشم زدن میں وہ کمرے سے باہر کھڑا تھا۔ اُس نے اپنی جیب سے چاقو نکالا اور جس رسی سے کتابیں جوتوں کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں کاٹ دی۔ پھر وہ اِدھر اُدھر ڈھونڈ کر کچھ اینٹیں اُٹھا لایا اور دروازے سے لے کر میز تک تھوڑی تھوڑی دُور خشک اینٹوں کے ڈھیر لگا دیے اور ہم دونوں نے بھی اس عذاب سے

نجات پائی۔ اب ڈاکٹر کہیں نظر نہ آتا تھا۔ بہت تلاش کے بعد وہ ایک درخت کے نیچے لیٹا ہوا ملا۔ وہ اپنا زہر کا لباس اُتار چکا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اُسے قابو میں کیا اور اُس کے پلنگ سے اُس کو کس کر باندھ دیا اور مُنہ میں رومال ٹھونس کر اور کس کر ڈھاٹا باندھ دیا اور اوپر سے ایک سفید چادر ڈال کر چارپائی ہم نے اپنے کندھوں پر اُٹھالی اور اس کوٹھی سے باہر نکل آئے۔ راستہ میں چند آدمی ہمیں ملے اُنہوں نے ممکن ہے اپنے دل میں کوئی شبہ کیا ہو لیکن ہم سے کچھ نہیں پوچھا تقریباً تین گھنٹے کے بعد ہم کریم الدین خاں کی کوٹھی پر پہنچ گئے +

۶- آخری منظر

اُسی روز کپتان نے کمانڈر اِن چیف کو ڈاکٹر مجیب الدین کے مل جانے اور پاگل ہو جانے کی اطلاع بذریعہ تار دی اور اُسی دن حکومت بنگال نے ڈاکٹر مجیب الدین کو اپنی نگرانی میں لے کر اُن کے دماغی مرض کا علاج بہترین سرکاری ڈاکٹروں کے سپرد کر دیا۔ فرصت کے وقت کپتان نے ڈاکٹر مجیب الدین کی ڈائری جو ہمیں اُن کی خواب گاہ سے دستیاب ہوئی تھی پڑھ کر سنائی جیسا پہلے مذکور ہو چکا ہے، اُس کا بہت سا حصہ نہایت غیر مربوط اور بے معنی تھا مگر یہ معاملہ جس کی تلاش و تحقیق میں ہم سرگرداں تھے بالکل صاف ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر مجیب الدین کے پاس ایک آسٹریلین تاجر آیا کرتا تھا اور ڈاکٹر کے ایجاد کردہ زہر سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ اِسی غرض کے لئے

وہ ڈاکٹر کے گھر پہنچا۔ اُس کا شیطانی گروہ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اُس کے اشارے پر انہوں نے ڈاکٹر مجیب الدین کو باندھ لیا اور موٹر میں ڈال کر اُڑا لے گئے۔ معاملہ کو پیچیدہ کرنے کے لئے یہ چال کھیلی گئی کہ کسی پردیسی مسافر کو لالچ دے کر اُسی وقت ہوٹل سے وہاں طلب کیا گیا، اور ڈاکٹر مجیب الدین نے جو زہر کی پچکاری کمانڈر اِن چیف کو تجربہ دکھانے کے لئے تیار کر رکھی تھی اُس کا تجربہ اُن ظالموں نے اِس مسافر پر اور ڈاکٹر مجیب الدین کے وفادار کتے پر کیا۔

ڈاکٹر مجیب الدین کو پہلے دہلی کے ایک مکان میں قید رکھا گیا اور پھر کلکتہ کے قریب بہرام پور منتقل کیا گیا اور وہاں ڈاکٹر کو زہر کی ایک بہت بڑی مقدار بنانے پر مجبور کیا گیا۔ یہی آسٹریلین تاجر اپنے ہوائی جہاز میں کبھی کبھی صبح کے وقت طلوعِ آفتاب سے قبل وہاں آتا تھا اور زہر بھر کر لے جاتا تھا +

اُسی روز کپتان اور اُن کے ساتھیوں اور میزبانوں کے نام مسٹر نوٹن کی طرف سے ایک دعوت نامہ آیا جس سے معلوم ہوا کہ صاحب موصوف اپنے ہوائی جہاز پر تمام معززینِ شہر کو ایک پُرتکلف دعوت آج شب کو آٹھ بجے دیں گے۔ دعوت کے اختتام پر وہ سول ایویئیشن پر ایک تقریر کریں گے اور بعد ازاں جو حضرات خوشی سے چاہیں گے اُن کو وہ کلکتہ کے گرد فضائی سیر بھی کرائیں گے۔ کپتان سے میں نے دریافت کیا کہ آپ

دعوت قبول کریں گے یا نہیں؟" کپتان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں، یہی توقع ہے۔ غالباً کنور سین ڈاکٹر مجیب الدین کے معاملہ سے بے خبر ہے یا نہیں لیکن اب بچ کر نہیں جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آ گئی شامت۔"

علی شیر نے جھنجلا کر کہا۔ "آپ کو تو بس کنور سین کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ ہر شخص آپ کے نزدیک کنور سین ہی ہے۔"

کپتان۔ "خیر وقت بتا دے گا کہ میرا قیاس بلکہ یقین صحیح ہے یا نہیں۔ یہ اتنا بڑا کام جو اس ملک میں پھیلا ہوا ہے صرف کنور سین جیسے فلسفی اور ماہر فن مجرم ہی کے بس کا ہے۔"

علی شیر۔ "کون سا کام؟"

کپتان۔ "سنیئے! کنور سین ہی کا کام ہے جس نے آسٹریلین تاجر کا بھیس بھر کر ڈاکٹر مجیب الدین کی خوفناک ایجاد سے فائدہ اٹھانے کے لئے اُن کو قید کیا۔ جس نے مسٹر نیوٹن کا بھیس بدل کر کلکتہ میں ہوائی جہاز کی فضائی سروس قائم کی اور موقع پا کر ارب پتی امریکن تاجر کلیفرڈ کا جہاز غرق کیا۔ تمام مسافروں کو اپنے ہوائی جہاز سے زہر کی پچکاریاں مار کر ہلاک کر دیا۔ پھر اس جہاز میں جو بے شمار دولت تھی اُس پر قبضہ کر لیا اور اب جوڈنر دیا جا رہا ہے یہ آخری چال ہے جس کے ذریعہ سے اپنے تمام دشمنوں سے بدلہ لینے کے علاوہ جس قدر خواتین بلائی گئی ہیں ان سب کے زیورات پر بھی جو شاید دو تین لاکھ روپے سے کم کی مالیت کے نہ ہوں گے قبضہ کیا جائے گا۔ یہ ہے اس نئے پلاٹ کی مختصر رُوداد اور

کنور سین کی سیہ کاریاں جو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے"۔

ہم دونوں حیرت سے کپتان کا مُنہ تکتے رہے اور اُس کی دیانت اور فکرِ رسا کی داد دیتے رہے +

ڈم ڈم کے فضائی اسٹیشن میں آج شام سے غیر معمولی چہل پہل ہے۔ مسٹر نیوٹن کے خرچ پر تمام میدان بجلی کے قمقموں سے رشکِ نیم روز بنا ہوا ہے۔ ہیو بلین کی آرائش بھی خوب خوب کی گئی ہے۔ میدان میں ہزاروں تماشائی جمع ہیں اور ہیو بلین کے قریب بکثرت موٹریں کھڑی ہیں ہوائی جہاز جو ایک بلند اور مضبوط ستون سے بندھا ہوا ہے بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے اور ہوا میں معلق محل معلوم ہوتا ہے۔

ہم ایک لکڑی کے چوڑے زینہ سے چڑھ کر ہوائی جہاز کے اوپر ایک وسیع کمرے میں پہنچے جس میں کھانے کی سجی سجائی میزوں کے گرد پچاس کرسیاں بچھی تھیں۔ کمرے کی کھڑکیوں کے قریب بڑے بڑے گملوں میں پام اُگ رہے تھے، میزوں پر خوشبودار پھول سجے ہوئے تھے اور تمام کمرہ ایک مسرت آگیں خوشبو سے مہک رہا تھا۔ تقریباً تمام مہمان آچکے تھے خود کنور سین (مسٹر نیوٹن) نے نہایت خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا اور اپنے قریب ہمیں بٹھایا۔ بالخصوص کپتان کو کنور سین کے عین مقابل بٹھایا گیا۔ مہمانوں میں خواتین کی تعداد نصف سے بھی زیادہ تھی۔ ان میں یا تو متمول تاجروں اور رؤسا کی بیویاں تھیں یا بڑے بڑے

انگریز عہدے داروں کی بیویاں تھیں اور یہ سب جواہرات سے مزین تھیں کنور سین کی دلچسپ گفتگو سے تمام حاضرین مسحور ہو گئے اور ہر شخص اپنے دل میں اُس کے اعلیٰ اخلاق، ذہانت اور وسعت معلومات کی دل ہی دل میں داد دے رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ اُس سے بڑھ کر بنی نوعِ انسان کا ہمدرد کوئی نہ ہوگا۔

کھانا ختم ہونے کے بعد تمام مہمانوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں سیاہی مائل سُرخ شراب رکھی گئی اور خود میزبان نے اس کی تعریف کرتے ہوئے بتا دیا کہ "وسط ایشیا میں سیاحت کرتے ہوئے ایک بڈھے چینی حکیم نے اُس کو یہ شراب ایک بڑی بوتل میں تحفتہً دی تھی اور یہ بتایا تھا کہ یہ ایک ہزار سال کی پُرانی شراب ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی کی خاصیت یہ ہے کہ سو برس کے بڈھے کو جوان بنا دیتی ہے اور ایسا سرور بخشتی ہے کہ انسان ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا" آج کے دن کی یادگار میں یہ نایاب چیز میزبان نے اپنے مہمانوں کی خدمت میں پیش کی ہے۔ خود اپنا گلاس کنور سین نے اٹھایا، تمام مہمانوں نے تقلید کی اور قریب تھا کہ اُنچاس لاشیں کمرے میں تڑپ کر ٹھنڈی ہو جائیں کہ کپتان نے چیخ کر کہا۔ "خبردار! اگر کسی نے اس شراب کو ہاتھ لگایا، یہ زہر ہلاہل ہے جس کا ایک قطرہ جان لینے کے لئے کافی ہے"!

کنور سین نے اپنا گلاس کپتان کی طرف پھینکا مگر کپتان اس کے لئے پہلے سے تیار تھا اُس نے اپنے ہاتھوں پر ربڑ کے دستانے اس سے پیشتر

ہی چڑھا لیے تھے۔ بڑی پھرتی کے ساتھ ایک بڑی پلیٹ اُس نے اپنے منہ کے آگے کر لی۔ زہر کی چھینٹیں اُڑیں اور شاید خود کنور سین ہی اُن کا شکار ہو جاتا مگر وہ پھرتی سے کود کر پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کے برابر ایک نوجوان انگریز خاتون بیٹھی تھی۔ چند ننھی زہر کی بوندیں اُس کے ہاتھ اور چہرہ پر پڑیں اور غریب نے اپنی کُرسی ہی پر بیٹھے بیٹھے جان دے دی۔ کپتان نے کود کر کنور سین کا گلا پکڑ لیا۔ تمام کمرہ خواتین کی چیخوں اور آہ وزاری سے گونجنے لگا۔ لوگ ہر طرف بھاگ رہے تھے اور عجیب کھلبلی مچ رہی تھی خفیہ پولیس کے جوان جو کپتان کے اشارے پر موقع کے منتظر تھے آگے بڑھے اور کنور سین اور اُس کے تمام نوکروں کو گرفتار کر لیا۔ مہمانوں کو بمشکل اطمینان دلایا گیا کہ اُن کی جانیں اب بالکل محفوظ ہیں، اور احتیاط کے ساتھ اُن کو جہاز سے اُتار لیا گیا۔ مرنے والی خاتون کی لاش کو دو آدمیوں نے جو ربڑ کے دستانے پہنے ہوئے تھے اٹھا کر ایک صندوق میں بند کر کے نیچے اُتارا۔ جب سب لوگ جہاز سے نیچے اُتر آئے تو کنور سین نے کپتان سے ایک بار پھر جہاز پر جا کر ایک نہایت ضروری چیز لانے کی درخواست کی۔ کپتان نے یہ سوچ کر اب یہ قید میں ہے اس کے تمام ساتھی بھی مقید ہیں۔ ایسی حالت میں دشمن کی یہ حقیر درخواست منظور نہ کرنا تنگ خیالی ہے اُس کو اُوپر جانے کی اجازت دے دی اور دو سپاہی اس کی نگرانی کے لئے اُس کے ساتھ بھیج دیے۔

کپتان زینہ کے قریب کھڑا ہوا ایک اعلیٰ پولیس افسر سے گفتگو کر رہا تھا

اور زینے سے پشت لگائے کھڑا تھا۔ دفعتہً اُس نے ایک دھکا محسوس کیا پیچھے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز کے لنگر کی رسّی دفعتہً کاٹ دی گئی ہے اور جہاز نہایت تیزی سے ہوا میں بلند ہو رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے ہم سب حیران رہ گئے اور کچھ نہ کر سکے۔ کپتان نے چیخ کر کہا۔" سرکاری ہوائی جہاز جو اسٹیشن میں موجود ہو تعاقب کے لئے بھیجا جائے"۔

ابھی کپتان یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ہم نے دیکھا کنور سین کے ہوائی جہاز میں آگ لگ گئی ہے اور ہوا میں بڑے بڑے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔

کپتان نے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔" آہ! ناقابلِ تسخیر کنور سین"۔

پُراسرار خط

سُراغ رسانی کا ایک حیرت انگیز فسانہ

پہلا باب

صبح کے تقریباً نو بجے ہوں گے۔ کپتان عباس علی خاں اپنی کوٹھی واقع دریا گنج کے برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے صبح کی ڈاک دیکھ رہے ہیں۔ سب سے پہلے اخبار و رسائل کھول کر اُن پر ایک نظر ڈالی پھر جلد جلد اُن کو اکٹھا کر کے قریب کی میز پر رکھ دیا۔ اُس کے بعد کھلے ہوئے کارڈ دیکھے۔ اِن میں سے بعض پر پنسل سے نشان لگا کر ایک طرف رکھ دئے اور اکثر کو پھاڑ کر ٹوکری میں ڈال دیا۔ اس کے بعد لفافوں کا نمبر آیا۔ سب سے پہلے لفافوں کے پتوں کو غور سے دیکھا اور اُن میں سے ایک پر کسی قدر حیرت کی نظر ڈالی کیونکہ طرزِ تحریر کاتب خط کی نرم و نازک اُنگلیوں کی غمازی کر رہی تھی

کپتان کے چہرہ پر خفیف مسکراہٹ نمودار ہوئی اور چہرہ سے معلوم ہونے لگا
کہ وہ یہ راز معلوم کرنے کے لئے بے چین ہے کہ اس خط کا لکھنے والا کون
ہے، مگر اُس نے آہستہ آہستہ لفافہ کا ایک کنارہ چاک کر کے خط نکالا لکھا تھا۔
"کپتان صاحب! آپ مجھے نہیں جانتے، مگر میں نے آپ کو
ہزاروں انسانوں میں سے ایک خاص مقصد کے لئے انتخاب
کیا ہے۔ یہ تو بتانا مشکل ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا لیکن اتنی
بات ضرور ہے کہ آپ کے جو کارنامے اس سے قبل میں اخبارات
میں دیکھ چکی ہوں شاید اُنہی کا اثر ہے کہ اپنی مصیبت کے وقت
مجھے آپ کا خیال پیدا ہوا اور میں آپ سے مدد کی طلبگار ہوتی ہوں
میں اپنے متعلق اِس وقت اِس سے زیادہ کچھ نہیں بتاؤں گی کہ
میں سیٹھ قاسم بھائی کی بیٹی ہوں جن کے بمبئی اور احمد آباد میں
چوبیس بہت بڑے بڑے سوتی کپڑا بُننے کے کارخانے ہیں
دو تین روز ہوئے میرے والد کسی تجارتی کام سے دہلی تشریف
لا رہے تھے۔ میں دہلی کی سیر کے خیال سے اُن کے ہمراہ تھی، راستہ
میں ہمارے ہی فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ایک اور شخص نہایت
خوش پوش، خوش مزاج اور اُس کے قول کے مطابق دہلی کا رئیس اعظم
نواب محی الدین مرزا بھی ہمارا شریک سفر تھا۔ اس کے ہمراہ
اُس کی حسین بیٹی انجم آرا بھی تھی جس کے متعلق یہ بھی معلوم ہوا
تھا کہ وہ انگلستان ہی میں پیدا ہوئی تھی اور وہیں اُس نے تعلیم پائی تھی۔

ہمارا سفر نہایت لطف کے ساتھ گذرا۔"

کپتان اس قدر دلچسپی سے اس خط کے پڑھنے میں مصروف تھا کہ وہ قطعاً بھول گیا کہ اُس کی اُنگلی میں جلتا ہوا سگریٹ سلگتے سلگتے آخر اس حد تک آپہنچا کہ کپتان کی اُنگلیوں میں چھکا لگا اور کپتان نے گھبرا کر اس زور سے ہاتھ جھٹکا کہ سگریٹ کے ساتھ خط بھی زمین پر گر پڑا۔ ساتھ ہی کسی نے قہقہہ لگایا۔ کپتان نے نظر اُٹھائی۔ دیکھا علی شیر کھڑے ہیں۔

"یہ کس کافر ادا کا خط تھا جس نے آپ کو اس قدر حواس باختہ کر دیا کہ سگریٹ کی بھی خبر نہ رہی۔ واللہ کپتان تم بھی کسی عجائب خانہ میں رکھنے کے قابل ہو۔" یہ کہتے کہتے علی شیر ایک قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کپتان نے پہلے تو جلدی سے خط اُٹھایا اور پھر علی شیر کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ہو تو تم بڑے منحوس۔ اس وقت صبح ہی صبح کہاں سے آمرے۔ سارا مزہ کرکرا کر دیا۔"

"ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ آج کوئی نئی دُھن ہے۔ آخر ہم بھی تو سُنیں آپ نے کہاں دل لگایا ہے؟"

"اچھا زیادہ بکواس نہ کرو۔ لو سنو اس وقت کی ڈاک سے ایک بڑا مزیدار خط آیا ہے۔ پہلے تو خاموشی سے آخر تک سُن لو پھر کچھ رائے زنی کرنا۔ دیکھو بیچ میں نہ بولنا۔" یہ کہہ کر کپتان نے پھر ابتداء سے شروع کیا اور جتنا حصہ اُوپر ختم ہو چکا ہے اُس سے آگے یوں پڑھا:۔

"لڑکی نہایت شائستہ اطوار تھی، مگر اُس کا مغربی لباس اور اُس کی سگریٹ نوشی مجھے روحانی اذیت پہنچاتی تھی۔ نواب مذکور کی

خوش گفتاری نے والد پر اس قدر اثر کیا کہ میں خوف زدہ ہو گئی
اُن کی حالت ایک مسمریزم کے معمول جیسی ہوتی جاتی تھی۔ چنانچہ
دہلی آنے سے قبل میرے والد نے نواب کی میزبانی قبول کر لی
اور یہ بات طے پا گئی کہ ہم نواب ہی کی کوٹھی میں قیام کریں جو
پُرانی چھاؤنی خیبر پاس کے قریب واقع ہے۔ پرسوں شام کو
جب کہ میرے والد اپنے کاروبار کی وجہ سے باہر گئے ہوئے
تھے۔ انجم آرا مجھے اور میری بوڑھی دایہ کو موٹر میں سیر کرانے
کے لئے لے گئی۔ مغرب کے بعد ہم اپنی قیام گاہ پر واپس آئے
تو معلوم ہوا کہ والد میرے نام ایک رقعہ چھوڑ گئے ہیں جس میں
مجھے اطلاع دی تھی کہ وہ اسی وقت کسی اشد ضروری کام سے
شملہ جا رہے ہیں اور تین روز میں واپس آ جائیں گے۔
مجھے اطمینان دلاتے ہوئے اس دوران میں انجم آرا کے
پاس قیام کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ لکھنا فضول ہے کہ اس واقعہ
نے میرے دل میں انتہائی تشویش پیدا کر دی۔ رات میں نے
سخت بے چینی کے ساتھ گذاری۔ کل دن بھر میں نے نواب
کو نہیں دیکھا۔ لیکن کل شب کو میں نے اپنی خواب گاہ سے جو بالائی
منزل پر پورب کی طرف واقع ہے رات کے گیارہ بجے ایک
چیخ کی آواز سنی۔ میں نے فوراً اپنی کھڑکی کھولی۔ پورب کی طرف
ہمارے بنگلہ سے ملا ہوا ایک اور دو منزلہ بنگلہ ہے اُس کے اوپر

کی منزل میں بجلی کی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جس کھڑکی سے روشنی نکل رہی تھی اُس پر کچھ ایسے عکس پڑے جیسے دو آدمی کسی تیسرے آدمی کو ہاتھ اور ٹانگیں پکڑ کر اٹھائے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ میں کئی گھنٹے تک اپنی کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی لیکن میں نے نہ کوئی آواز سنی اور نہ کچھ دیکھا مگر جو کچھ دیکھ اور سُن چکی تھی اُس نے میرے دل میں ایک طوفان بپا کر رکھا ہے میں نہیں جانتی کہ کیا ہو چکا اور کیا ہونے والا ہے۔ بہر حال مجھے ایک عظیم الشان خطرے کا احساس ہے۔ کپتان صاحب! مجھے اپنی جان کی فکر نہیں مگر مبادا اباجان کو کوئی تکلیف پہنچی ہو یا پہنچے اس خیال سے میری روح لرزتی ہے۔ میں پولیس کی مدد طلب کر سکتی تھی لیکن میں ڈرتی ہوں کہ پولیس کی مداخلت کوئی نیا فتنہ نہ کھڑا کر دے۔ میرا دل اندر سے کہتا ہے کہ اس معاملہ میں صرف آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ اس لئے میں جرأت کر کے نہایت لجاجت کے ساتھ آپ سے التجا کرتی ہوں کہ خدا کے لئے اس مصیبت میں آپ میری مدد کریں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے گا۔

پتہ یہ ہے کہ خیبر پاس کے مارکیٹ کے بالکل سامنے جو راستہ شمال کی طرف جاتا ہے اُس پر سیدھے چلے جائیں۔ جہاں بنگلوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے وہاں ایک قبرستان شروع ہوتا ہے

اور اُس کے دروازے پر دونوں طرف دو بڑے بڑے یوکلپٹس کے درخت کھڑے ہیں۔ بنگلے کے پشت کی طرف ایک اور چھوٹا سا راستہ ہے جس سے نکل کر پگڈنڈی قبرستان میں سے ہوتی ہوئی بہت دُور تک چلی گئی ہے۔ فقط :

"پریشان حال سُلطانہ"

کپتان عباس علی خاں نے خط ختم کر کے لفافہ کے اندر رکھ دیا اور علی شیر کی طرف دیکھنے لگا۔

علی شیر۔ "معاملہ تو بڑا دلچسپ معلوم ہوتا ہے مگر یار کپتان! کہیں کسی نے تمھیں فُول تو نہیں بنایا؟" کپتان نے ایک منٹ تک کوئی جواب نہ دیا اور ایک بار اس کے حیرت انگیز دماغ نے اِس طویل خط کے ضروری اجزا کو یکجا کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ "واقعات میں حقیقت کی جھلک ہے۔ جس خوش اُسلوبی کے ساتھ کام کیا گیا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے پلاٹ تیار کرنے والے کی ذہانت اور فن سے اُستادانہ واقفیت کی داد دینی پڑتی ہے۔ قیاس غالب ہے کہ نواب محی الدین مرزا کی شکل میں کنور سین نے جنم لیا ہے۔ یہ تو کنور سین ہی کے ہتھکنڈے ظاہر ہو رہے ہیں اور ہو نہ ہو اُس کے جرائم کی شریک اُس کی بیٹی بملا ہی کا دوسرا نام انجم آرا ہے۔"

"یار کپتان! تمھیں تو خواب میں کنور سین ہی نظر آتا ہوگا؟"

"خیر اصل حقیقت تو تحقیق کے بعد ہی معلوم ہو سکے گی لیکن ہماری زندگی میں پھر ایک بار دلچسپی کے سامان ہو چلے ہیں۔ خدا جانے کیا سبب الاسباب ہے

ورنہ میں تو اس خشک زندگی سے بہت ہی اُکتا گیا تھا۔ اب سوال یہ ہے
کہ کیا کرنا چاہیے؟ ...... دن کے وقت تو کوئی خاص کام ہو نہیں سکتا
صرف یہی ہو سکتا ہے کہ موٹر میں جا کر موقعۂ واردات دیکھ آئیں۔ آج کل
میاں رحمت علی خاں کہاں ہیں؟"

"ابھی ایک ہفتہ ہوا قیصر گنج گئے ہیں۔"

"میں نے سُنا تھا کہ پچھلے دنوں صاحبزادے نے کوئی ہوائی جہاز
بھی تو لیا تھا؟"

"جی ہاں! ہوائی جہاز کیا کھلونا ہے صرف دو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ میں
نے بھی رحمت علی خاں کے ساتھ پرواز کی مشق کی ہے اور اُن کے ساتھ
ہی میں بھی دہلی فلائنگ کلب کا ممبر بنا تھا۔ بلکہ کل بھی میں نے یہ جہاز اُڑایا
تھا۔ مشین بڑی نفیس ہے۔"

کپتان۔ "ہوں ... اچھا تو آپ بھی اِس فن میں دسترس رکھتے
ہیں۔ تمھیں کچھ اندازہ ہے، ہوائی جہاز سے اگر جائیں تو قیصر گنج کتنی دیر
میں پہنچ جائیں گے؟"

"جی ہاں ایک روز ہم دونوں گئے تھے۔ ہوائی جہاز سے ہم پورے
پچاس منٹ میں رحمت علی خاں کی کوٹھی قیصر منزل کے سامنے جو وسیع
میدان ہے اُس میں جا اُترے تھے۔"

"تو یہ جہاز آج کل یہیں ہے۔"

"جی ہاں کہتا ہوں نا کہ میں نے کل شام بلند کیا تھا۔"

کچھ دیر کے بعد موٹر تیار ہو کر آگیا اور یہ دونوں دوست اُس میں بیٹھ کر پرانی چھاؤنی کی طرف روانہ ہوئے اور خیبر پاس کے مارکیٹ سے شمال کی طرف مڑ کر سیدھے چلے گئے جب اُس کوٹھی کے بالمقابل پہنچے جس کے دروازے پر دو یوکلپٹس کے درخت کھڑے تھے تو کپتان نے اپنی کار روک کر اور علی شبر کو وہیں چھوڑ کر خود کوٹھی کے اندر گیا۔ ابھی دس قدم بھی نہ گیا تھا کہ جھاڑی سے نکل کر ایک شیر افگن کُتّے نے کپتان پر حملہ کیا اور بڑے زور سے بھونکنے لگا۔ کپتان کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اور پھر آہستہ آہستہ سیٹی بجانے لگا۔ رفتہ رفتہ کُتّے نے بھونکنا بند کر دیا اور دُم ہلانے لگا کُتّے کی آواز سُن کر ایک گوشے سے جدھر شاگرد پیشہ لوگوں کے مکانات تھے ایک بہت بوڑھا آدمی کسی قدر لنگڑاتا ہوا باہر نکل آیا اور کپتان سے پوچھنے لگا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟" کپتان نے کہا "میں بہت دور سے آرہا ہوں اور کشمیری دروازے جانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں راستہ بھول کر ادھر چلا آیا ہوں۔ کیا آپ مجھے صحیح راستہ بتا دیں گے؟"

"آپ جس راستہ سے آئے ہیں اُسی راستہ پر واپس جائیے۔ یہ راستہ دہلی شہر کی طرف نہیں جاتا۔"

کپتان۔ "کیوں بھئی ذرا سا پانی بھی پلاؤ گے؟"

"مجھے افسوس ہے کہ نہ میرے پاس یہاں پانی ہے اور نہ پانی پلانے کا کوئی برتن۔"

"مگر کیا اس کوٹھی میں کوئی نہیں رہتا۔ یہ تو آباد معلوم ہوتی ہے؟"

"جی ہاں نواب محی الدین مرزا کی صاحبزادی یہاں رہتی ہیں۔ آج کل کچھ علیل ہیں۔ کسی کو اُدھر جانے کی اجازت نہیں۔"

"اچھا اور یہ برابر کی کوٹھی میں کون رہتا ہے؟ میں وہیں جاکر پانی پی لوں گا۔"

"اِس میں نواب صاحب کے دوست مسٹر لارنس رہتے ہیں۔ اِس وقت تو وہ بھی موجود نہیں ہوں گے۔"

"مسٹر لارنس کیا کوئی انگریز ہیں؟"

"نہیں انگریز تو نہیں عیسائی ہیں۔"

"تو کیا اُن کا نوکر بھی موجود نہ ہوگا جو پانی پلا دے؟ شاید یہ سامنے والا راستہ تو اندر ہی اندر اِس کوٹھی سے اُس کوٹھی کو جاتا ہے؟"

"نہیں راستہ تو اِدھر سے تھا مگر بند کر رکھا ہے اور مسٹر لارنس کے پاس کوئی نوکر نہیں ہے۔"

دورانِ گفتگو میں کپتان کی تیز و متجسس نگاہوں نے تمام کوٹھی کا بہت اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا اور پشت کی طرف کا راستہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس وقت کوٹھی کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بالکل بند تھیں اور یہی حالت سامنے والی کوٹھی کی تھی۔ کپتان معذرت کر کے اپنی کار پر واپس چلا گیا اور اُس میں بیٹھ کر سیدھا گھر آیا۔

باب دوم

رات کے دس بجے عباس علی خاں اور علی شبر خاں اپنی موٹر سے
خیبر پاس کے قبرستان کی پشت پر جا اُترے۔ علی شبر اور عباس علی
بغیر کچھ کہے ہوئے قبرستان کی طرف چل دیے اور اُس سے گذر کر
اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے نہایت خاموشی کے ساتھ اُس احاطے میں
داخل ہوئے جس میں نواب محی الدین مرزا کے دوست مسٹر لارنس رہتے تھے
ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہایت تاریک رات تھی۔ کالے کالے بادلوں نے
تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی پر بھی سیاہ پردہ ڈال دیا تھا۔ ہوا بھی بالکل
بند تھی۔ کپتان کو اندھیرے میں بغیر چاپ کی آہٹ پیدا کئے چلنے کی بڑی
مشق اور مہارت تھی۔ اس لئے پیڑوں کی آڑ لیتے ہوئے تھوڑی ہی دیر میں
وہ کوٹھی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ نیچے کی منزل میں ایک کمرے کے اندر
برقی لیمپ جل رہا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور جس درخت کے پیچھے عباس علی
چھپا ہوا تھا وہ کھڑکی سے تقریباً نو فٹ کے فاصلہ پر تھا۔ اِس لئے جو کچھ
کمرے کے اندر ہو رہا تھا عباس علی اُس کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا بلکہ کمرے
کے اندر کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ ایک دُہرے
بدن کا بوڑھا آدمی جس کی لمبی ڈاڑھی میں آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے
ہیں ایک چھوٹی میز کے قریب کرسی پر بیٹھا ہے اُس کے چہرہ پر دہشت اور

فکر کے آثار نمایاں ہیں اُس کی آنکھیں مخمور اور غمگین معلوم ہوتی ہیں اُس کے
دونوں جانب دو آدمی انگریزی لباس پہنے ہوئے کھڑے ہیں اور اُن کے
چہروں پر ایک ظالمانہ مسکراہٹ نمایاں ہے۔ کمرے کے ایک گوشہ میں ایک
لمبے سوفے پر ایک جوان لڑکی مغربی لباس میں ملبوس لیٹی ہوئی بڑے انہماک
کے ساتھ سگریٹ پی رہی ہے بوڑھے آدمی کے سامنے میز پر ایک کاغذ
رکھا ہوا ہے اور کھڑے ہوئے دونوں آدمی اُس کو اس کاغذ پر دستخط کرنے
کے لئے مجبور کر رہے ہیں بوڑھا اگرچہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں معلوم ہوتا
لیکن نیم بیہوشی کی حالت میں بھی اُس کو خطرے کا احساس ہے قلم اُس کے
ہاتھ میں دیا جاتا ہے مگر وہ نارضامندی کا اظہار کرنے کے لئے سر ہلاتا ہے
اور قلم ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ ایک شخص اپنی جیب سے ایک عجیب قسم کا
آلہ نکالتا ہے۔ اُس کو دیکھ کر غریب بوڑھے کی گھگی بندھ جاتی ہے اور وہ
کانپنے لگتا ہے۔ وہ شخص بوڑھے سے پوچھتا ہے، دستخط کرو گے؟ بوڑھا
گردن ہلا کر انکار کرتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہی شخص آگے بڑھتا ہے اور بوڑھے
کا بایاں ہاتھ پکڑتا ہے اور جھٹک کر چھوڑ دیتا ہے۔ مگر اس دوران میں
کپتان عباس علی اپنی جگہ سے یہ دیکھ لیتا ہے کہ بوڑھے کے بائیں ہاتھ کے
انگوٹھے پر ایک کترن لپٹی ہوئی ہے۔ وہ شخص بوڑھے کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اس
کا انگوٹھا اس خوفناک آلے کے اندر رکھتا ہے۔ ٹھیک اس وقت کپتان
نے برقی لیمپ کا نشانہ باندھ کر فائر کیا اور ساتھ ہی دوڑ کر کود تا ہوا کمرے کے
اندر گھس گیا۔ وہ چونکہ اندھیرے سے آیا تھا اس لئے ہر چیز صاف دیکھ سکتا تھا

لیکن جو لوگ کمرے کے اندر تیز برقی روشنی میں تھے دفعتہً اندھیرا ہو جانے سے بالکل کچھ نہ دیکھ سکتے تھے۔ دوسرے اس اچانک اور غیر متوقع حملے نے ان کو اس قدر ششدر کر دیا کہ قبل اس کے کہ وہ ہاتھ پیر ہلاتے کپتان نے ان دونوں کھڑے ہوئے آدمیوں کی کنپٹیوں پر اپنے پستول کے پچھلے سرے سے ایسی کاری چوٹ لگائی کہ دونوں چکرا کر زمین پر گرے اور اس سے پیشتر کہ وہ اُٹھ سکتے کپتان نے بوڑھے آدمی کو گود میں اٹھا لیا اور پھرتی سے کھڑکی تک لے جا کر بوڑھے کو علی شیر کی گود میں دے دیا اور اُس کے بعد کمرے کی طرف مڑا اتنی دیر میں لڑکی نے سوئچ دبا کر دوسرا برقی لیمپ روشن کر دیا تھا۔ دونوں ہزیمت خوردہ جوان اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو چکے تھے لیکن کپتان کے دونوں ہاتھوں میں دو ریوالور تھے جن کی نالیاں انہی دونوں کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔

کپتان "۔خبردار! اگر جان عزیز ہے تو اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔"
دونوں اپنی اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے رہے، مگر اُن میں سے ایک نے غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا اندھیر ہے؟ تم کون ہو جو اس طرح ایک شریف آدمی کے گھر میں گھس کر قتل کی دھمکیاں دیتے ہو؟"

"بے شک! آپ سے زیادہ شریف اور کون ہوگا کیونکہ ابھی تو ایک کروڑپتی تاجر کو مقید کر کے اور دھمکیاں دے دے کر جعلی دستاویزوں پر دستخط کرا رہے تھے۔"

"میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ آپ میری کوٹھی سے نکل جائیں ورنہ میں

پولیس کی مدد طلب کرنے پر مجبور رہوں گا۔"

کپتان۔"جی ہاں! بے شک ضرور طلب کیجئے۔ پولیس کو بھی آپ کی طلب ہے۔ . . . . . . کہو بملا! تمھارا کیا حال ہے؟"

وہی شخص۔"یہ کیا بکواس ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میرا نام محی الدین مرزا ہے اور یہ میری لڑکی انجم آرا ہے۔"

جی ہاں میں خوب جانتا ہوں آپ تو ہمارے پرانے دوست ہیں آخر اس قدر تجاہلِ عارفانہ کی کیا ضرورت ہے مدت کے بعد آپ کی زیارت ہوئی ہے۔ آپ کسی پردے میں نمودار ہوں۔ کم از کم عباس علی اپنے مہربان دوست کنور سین کو بھلا کب بھول سکتا ہے۔ پچھلی دفعہ تو خوب بھاگے تھے مگر اب فرمائیے، جہنم رسید کر دوں؟"

محی الدین مرزا (کنور سین)"تم جیسے بزدلوں سے اور کیا امید ہو سکتی ہے۔ میاں صاحبزادے! میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ خواہ مخواہ مجھ سے نہ اڑو۔ تمھارے کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔ ایک نہ ایک دن نقصان اٹھاؤ گے۔"

یہ کہہ کر کنور سین نے لارنس کی طرف دیکھا۔ بملا نے اپنے بائیں پیر کو صوفے کے نیچے کھینچ کر جوتے کی نوک سے فرش پر زور دیا۔ کنور سین اور لارنس دفعتاً اپنی جگہ سے اچھلے۔ کپتان جس جگہ کھڑا تھا اس جگہ کمرے کے فرش کا بہت بڑا ٹکڑا یکایک نیچے کی طرف دھس گیا اور کپتان ایک تہہ خانے کے اندر گرا۔ تہہ خانہ اس قدر نیچا تھا کہ گرتے ہی کپتان بیہوش ہو گیا کنور سین اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

کنورسین۔ "شاباش بلا! تمھیں بڑے وقت کی سوجھی ورنہ اس وقت کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی، مگر اب سب سے پہلے اس کمبخت کو پوری طرح قابو میں لانا ہے اور پھر ہاتھ سے نکلے ہوئے شکار کو دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ مجھے یقین کامل ہے۔ عباس علی کے آدمی بوڑھے کو اس کی کوٹھی پر لے گئے ہوں گے"۔

لارنس۔ "خیر کہیں لے گئے ہوں۔ جب تک یہ شخص ہمارے قابو میں ہے مفرور کا پتہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ ...... یہ کون شخص ہے؟"

کنورسین۔ "کپتان عباس علی خاں خواہ مخواہ لوگوں کے کاموں میں دخل دیتا پھرتا ہے لیکن آدمی نہایت خطرناک ہے۔ تم ابھی اس کے ہتھکنڈوں سے واقف نہیں ہو"۔

لارنس۔ "خیر دیکھا جائے گا ایسے ایسے چھوکرے میرے ناخنوں میں پڑے ہیں"۔ کنورسین نے لارنس کی طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ خود کنورسین عباس علی خاں کا سچا قدردان ہے اور لارنس کی شیخیوں کو وہ کچھ وقعت نہیں دیتا۔ کنورسین نے تین بار گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر میں ایک کابلی پٹھان اور دو مضبوط ملازم کمرے میں داخل ہوئے۔ تینوں کو کنورسین نے حکم دیا کہ "تہہ خانہ میں جاکر جو شخص وہاں بیہوش پڑا ہے اُسے اچھی طرح رسّوں میں جکڑ کر یہاں لے آؤ"۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور تینوں آدمی عباس علی خاں کو اٹھائے ہوئے کمرے میں لائے اور کنورسین نے خود عباس علی خاں کی تلاشی لی۔ صرف

چند کارتوس ملے۔ یا وہ دونوں ریوالور ہاتھ لگے جو ایک ملازم تہہ خانے میں سے عباس علی خاں کے ہاتھ سے چھڑا کر لایا تھا۔ یہ تینوں ملازم پہرہ پر مقرر ہوئے اور ان کو اسی کمرہ میں چھوڑ کر کنور سین اور اُس کے ساتھی اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے گئے۔ عباس علی کو جب ہوش آیا، کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اس کے تینوں محافظ آرام سے سو رہے تھے۔ اُس نے آہستہ آہستہ دانتوں سے اپنے ہاتھوں کی بندشیں کھولیں اُس کے بعد آزاد ہو جانا صرف چند منٹ کا کام تھا۔ اُس نے دروازے کو کھولنا چاہا لیکن اُس میں تالا لگا ہوا تھا۔ اسی طرح کھڑکی مقفل تھی۔ اب صرف ایک ہی صورت ہو سکتی تھی اسی کمرے میں اوپر کی منزل پر جانے کے لئے ایک زینہ بھی تھا عباس علی نے جانے کے لئے یہی راستہ اختیار کیا اور بیٹھ کر آہستہ آہستہ ایک ایک سیڑھی ٹٹول کر اوپر جانے لگا۔ زینہ بہت کافی چوڑا تھا۔ اُس کے ایک طرف دیوار تھی مگر دوسری طرف لکڑی کا جنگلہ تھا۔ جب اُس نے چھٹی سیڑھی پر قدم رکھا تو کمرے کے دوسری طرف سے ایک لمبی اور آگے سے گول چیز بڑی تیزی کے ساتھ آئی اور اُس کے سر کے قریب سے گذرتی ہوئی دیوار میں کھٹ سے لگی۔ اگر وہ سیدھا کھڑا ہو کر زینہ پر قدم رکھتا تو بلا شبہ یہ چیز اُس کا سر توڑ دینے کے لئے کافی تھی۔ عباس علی مزید احتیاط کے ساتھ باقی سیڑھیاں طے کر کے اُوپر کی منزل پر جا پہنچا۔ یہاں صرف ایک کمرہ تھا لیکن اُس کی وضع نہایت عجیب تھی۔ اس کی چاروں دیواروں میں چار کھڑکیاں تھیں۔ ان کھڑکیوں پر چوڑا چھجّہ آگے کی طرف نکلا ہوا تھا اس چھجّہ کی زیرین سطح آئینہ کی تھی چھت کے وسط میں

ایک پانچ فٹ مُربع روشندان تھا۔ اُس کی چھت ڈھائی تین فٹ اُونچے چار پاؤں پر قائم تھی۔ اُس کی چھت بھی نیچے کی طرف آئینے کی تھی۔ اس روشندان کے بالکل نیچے ایک بہت بھاری میز تقریباً چھ فٹ مربع رکھی ہوئی تھی۔ اس میز کے وسط میں ایک آئینہ لگا ہوا تھا۔ عباس علی نے ذرا سی دیر غور کیا تو اس آئینہ اور کھڑکیوں اور چھت کے آئینوں کی غایت معلوم ہوگئی۔ ان تمام چیزوں کی ترکیب کچھ اس طرح رکھی گئی تھی کہ کوٹھی کے احاطہ میں جتنی چیزیں ہوں، ہر چیز کا عکس اس میز والے آئینہ پر پڑتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کمرے میں اس میز پر بیٹھ کر کام کرنے والا یہ چاہتا ہے کہ کوٹھی کے اندر آنے جانے والوں سے ہوشیار رہے ظاہر ہے کہ ایسی احتیاط کسی خلاف قانون کام ہی کے لئے کی جا سکتی ہے کپتان میز پر چڑھ گیا۔ ہاتھ اُوپر کی طرف پھیلائے جا بھی چھت سے تقریباً ایک فٹ نیچے تھے۔ کپتان نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی کمرے کے ایک گوشے میں ایک کُرسی رکھی تھی پہلے تو اُس کی نشست پر کپتان نے اپنا پیر رکھ کر یہ دیکھنا چاہا کہ بوجھ سہارے گی یا نہیں۔ فوراً کرسی میں ایک عجیب قسم کی کھٹ پٹ پیدا ہوئی۔ کپتان نے اپنا پیر کھینچ لیا۔ اب کرسی کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اگر پیر کا زور دینے کی بجائے خود بیٹھ جاتا تو دونوں ہاتھ پیر اور جسم ایسا جکڑا جاتا کہ کرسی سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہو جاتا۔ مگر جن چیزوں سے گرفت ہوتی تھی ایک دفعہ اُن میں حرکت پیدا ہو جانے کے بعد تالا لگ چکا تھا اور اب کرسی بالکل محفوظ تھی۔ کپتان نے کرسی اٹھا کر میز پر رکھی اور اُس پر

قدم رکھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کے ہاتھ روشندان کے پاؤں تک پہنچ گئے۔ وہ چھت
پر جانا چاہتا تھا اور جا سکتا تھا لیکن وہ کرسی کو میز پر رکھا ہوا چھوڑ جانا نہیں چاہتا
تھا۔ اس لئے اس نے نیچے اُتر کر کرسی کو اس کی جگہ رکھ دیا اور پھر خود میز پر چڑھ
کر اس زور سے اُچھلا کہ روشندان کا نیچے کا کنارہ ہاتھ آ گیا۔ بظاہر یہ بڑا
خطرناک کام تھا لیکن عباس علی نے اپنی عمر بھر میں سوائے جمناسٹک اور
ورزشی کھیلوں کے اور کیا ہی کیا تھا۔ اُس کے لئے چھت پر پہنچ جانا چند سیکنڈ
سے زیادہ کا کام نہ تھا۔ اس کمرے کی چھت بالکل سپاٹ تھی اور کناروں پر کوئی
منڈیر بھی نہ تھی۔ خوش قسمتی سے رات تاریک تھی۔ لیکن پھر بھی احتیاطاً عباس علی
روشندان کی آڑ لے کر چھت پر سیدھا لیٹ گیا اور روشندان میں نیچے کی طرف
جھانکنے لگا۔ اُس نے نیچے کی منزل میں لوگوں کے بولنے کی آواز سنی۔ اس
وقت نصف شب گذر چکی تھی۔ بلکہ صبح ہونے میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت
باقی نہ ہو گا۔ کنور سین اپنی خواب گاہ سے اُس کمرے میں آیا جس میں عباس علی
مقید تھا اُس نے دیکھا کہ تینوں پہرے دار غافل پڑے سو رہے ہیں اور عباس علی
کمرے سے غائب ہے اُس نے فوراً لارنس کو جگایا اور تحقیقات شروع کی
سب سے پہلے کمرے کے تالوں کی آزمائش ہوئی سب بدستور لگے ہوئے تھے
اُن کی کنجیاں خود کنور سین کے پاس تھیں۔ کمرے کا گوشہ گوشہ دیکھ ڈالا لیکن
عباس علی خاں کا پتہ نہ چلا نیچے کے تہہ خانہ کی تلاشی لی گئی اس کا دروازہ بھی
بدستور مقفل تھا اور اندر سے تہہ خانہ بالکل خالی تھا۔ اب اوپر والے کمرے کی
باری آئی لارنس اور کنور سین اوپر چلے مگر زینہ پر چڑھنے سے بیشتر لارنس نے

دیوار پر لگا ہوا ایک بٹن دبایا جس سے چھٹی سیڑھی کا تعلق اس خوفناک آلے سے منقطع ہو گیا جو ایک بے خبر زینہ پر چڑھنے والے کی سرکوبی کے لئے بنایا گیا تھا۔ دونوں اُوپر پہنچے۔ لارنس نے سب سے پہلے اُس میز کا معائنہ کیا جو کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی تھی۔ عباس علی اس خطرے سے خوب واقف تھا۔ اس لئے جب اُس نے اُوپر کی منزل پر آنے کی آہٹ سنی تو اسی وقت روشندان کی چھت پر چڑھ گیا جہاں سے وہ خوب جانتا تھا کہ اُس کا عکس میز پر نہ پڑ سکے گا۔ لارنس نے بجلی کی روشنی میں میز کا بغائیت نظر معائنہ کیا اور اُس کو پورا اطمینان ہو گیا کہ عباس علی اس کمرے میں نہیں آیا۔ دفعتہً اُس کی نظر کرسی پر پڑی۔ اب تو گمان غالب ہوا کہ عباس علی اس کرسی پر ضرور بیٹھا ہے لیکن سوال یہ تھا کہ بیٹھا تو آزاد کیونکر ہوا۔ بڑی دیر تک آپس میں بحث ہوتی رہی اور عباس علی چھت پر بیٹھے بیٹھے اس بحث سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہ دونوں حیران تھے کہ تمام کھڑکیوں اور دروازوں پر تالے بدستور لگے رہے پھر عباس علی کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ یہاں سے اُکتا کر یہ لوگ نیچے اُترے۔ تمام کوٹھی کے احاطے کی تلاشی لی گئی مگر مقصد حاصل نہ ہوا۔ اس جستجو میں سپیدۂ صبح نمودار ہوا اور راستے چلنے لگے۔ کچھ چرواہے اپنے جانور لے کر نکلے۔ اور کچھ دودھ بیچنے والے دودھ بہنگیوں پر رکھ کر یا سروں پر اُٹھائے ہوئے لے چلے۔ ان کی ایک پارٹی کوٹھی کی پشت کی طرف سے ہو کر گذر رہی تھی کہ عباس علی نے چھت پر سے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ پہلے تو یہ لوگ حیران رہ گئے اور چاروں طرف حیرت سے دیکھنے لگے

لیکن آخر عباس علی خاں نے ان کو اپنی طرف متوجہ کر ہی لیا۔ ان میں سے کچھ نوجوان چھوکرے بھی تھے جو ایک مردِ معقول کو چھت پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑے۔ بعض پر جن بھوت کا خیال کر کے ایک خوف طاری ہو گیا اور بعض تو ایک طرف کو بے تحاشا بھاگ گئے۔ اس شور و غل میں کوٹھی کے آدمی بھی باہر نکل آئے عباس علی نے دودھ والوں اور چرواہوں کی موجودگی میں خود کنور سین کو مخاطب کر کے یوں کہنا شروع کیا۔ "ارے بھئی! یہ کیا مذاق ہے؟ سیڑھی لگواؤ نہ، ہم تو یہاں بیٹھے بیٹھے سوکھ گئے۔ کنور سین نے دل میں سوچا کہ عباس علی تو ہاتھ سے نکل گیا لیکن اگر سیڑھی لگانے میں پس و پیش کیا تو دن کا وقت ہے۔ غیر لوگ موجود ہیں۔ معاملہ پولیس تک ضرور پہنچے گا لہٰذا جو مذاق کی صورت عباس علی نے پیش کی ہے اس کو چار و ناچار قبول کرنا چاہیئے۔ سیڑھی منگوائی گئی اور عباس علی خاں نہایت مزے سے نیچے اُترے اور مسٹر لارنس اور کنور سین سے نہایت گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کر کے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔ افسوس ہے صبح کا ناشتہ میں آپ کے ساتھ نہیں کر سکا۔

باب سوم

عباس علی کو رخصت کر کے کنور سین اور مسٹر لارنس کمرے کے اندر آئے۔ دونوں کے خیالات کی دنیا گوناگوں جذبات سے آباد تھی۔ کچھ

دیر خاموشی کا عالم رہا۔ اِدھر کنور سین چوٹ کھائے ہوئے شیر کی طرح دل ہی دل میں بپھر رہا تھا اور ہاتھ سے نکلے ہوئے شکار کو دوبارہ پھانسنے کی تدابیر سوچ رہا تھا۔ اُدھر کمینہ طبیعت لارنس کبھی یہ سوچتا تھا کہ اگر عباس علی پھر پھنس گیا تو بغیر جوتے مارے نہ چھوڑوں گا۔ اور کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ لعنت بھیجو مجھے اپنے کام سے کام ہے۔ مجھے جو آج کام کرنا ہے اُس کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ کنور سین خود عباس علی کو سمجھ لے گا۔ کبھی اپنی چالاکی پر ناز کرتا تھا کہ دیکھو عباس علی میرے راز کا پتہ نہ چلا سکا۔ آخر کنور سین نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔ ایک ایسی متحکمانہ آواز سے جو حکومت کرنے ہی کے لئے بنی تھی۔ "دیکھو لارنس! تمھیں ٹھیک تین بجے مہاراجہ صاحب بہرام پور کی کوٹھی پر پہنچ جانا چاہئے۔ تمھیں کس وقت سے اپنا کھیل دکھانا ہے۔ ساڑھے تین بجے سے ...... ہاں ٹھیک ہے۔ تم کو جو کچھ تیاری کرنی ہے کر لو۔ مجھے بھی کئی ضروری کام آج دن میں کرنے ہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں چلا جاؤں گا۔ شام کو ٹھیک سات بجے یہاں واپس آجانا کسی حالت میں تاخیر نہ ہونی چاہئے۔"

عباس علی خاں کنور سین سے رخصت ہو کر علی شیر کے مکان پر پہنچے معلوم ہوا کہ ابھی واپس آئے ہیں۔ عباس علی نے دریافت کیا "خیریت سے پہنچ گئے تھے؟"

علی شیر۔ "بالکل عافیت سے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ لوگ راہیں مزاحم

نہ ہوں، لیکن ہم بغیر کسی دقت کے فلائنگ اسٹیشن پر پہنچے۔ لائسنس میں لے ہی آیا تھا۔ دکھا کر رحمت علی کا ہوائی جہاز نکلوا کر اور اُس کو بٹھا کر روانہ ہوئے اور خیریت سے منزلِ مقصود پر پہنچے"۔

عباس علی۔ "رحمت علی خاں کو بڑا تعجب ہوا ہو گا؟"

شبیر علی۔ "ان کو واقعات بتا دئے تھے، وہ تو فوراً آنا چاہتے تھے مگر میں نے کہہ دیا کہ اس ڈرامہ میں تمھارا پارٹ یہی ہے کہ یہاں بیٹھے بڈھے کی حفاظت کرتے رہو۔ ہاں کہو تمھارے ساتھ کیسی گذری؟"

عباس علی۔ "اس تفصیل کا وقت بالکل نہیں ہے۔ اب تو میں جاتا ہوں۔ شام کو چھ بجے میرے مکان پر آجاؤ اور اپنے ہمراہ راجپال سنگھ کو بھی لیتے آنا۔ وہیں مجلس جمے گی۔ لو بھئی اب جاتے ہیں۔"

ساڑھے تین بجے کپتان عباس علی خاں مہاراجہ صاحب بہرام پور کی عالیشان کوٹھی پر پہنچے اور اپنا کارڈ بھیجا۔ راجہ صاحب اگرچہ کپتان سے واقف نہ تھے اور اُس وقت اُن کے چند خاص خاص احباب چائے پر مدعو تھے۔ ایک مدراسی جادوگر کچھ تماشا دکھانے والا تھا۔ مگر راجہ صاحب نے کپتان صاحب کو بھی اسی کمرے میں بُلا لیا جہاں اور سب لوگ جمع تھے اور بڑے تپاک سے ملے آمد کی غرض دریافت کی تو جواب میں عباس علی خاں نے صرف یہ کہہ دیا۔ "عرصہ سے آپ کی تعریف سنتا تھا بیٹھے بیٹھے آج خیال آیا کہ خود ہی حاضر ہو کر نیاز حاصل کروں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ازراہِ عنایتِ کریمانہ خاکسار کی اِس

جسارت کو معاف فرمائیں گے"۔

مہاراجہ صاحب نے کپتان کا مختصر تعارف اپنے دوستوں سے بھی کرایا اور تماشا بدستور شروع ہو گیا۔ کئی کھیل نہایت صفائی سے دکھائے گئے لیکن عباس علی خاں نے دیکھا کہ مدراسی جادوگر نے لوگوں کی نظر بچا کر کئی بار اُس کی طرف دیکھا اور ایک لمحہ کے لئے متفکر ہو گیا۔ آخر میں مدراسی جادوگر نے ایک چھوٹا سا لکڑی کا بکس نکالا اور سب حاضرین کو دکھایا۔ اب جادوگر نے درخواست کی کہ تمام حاضرین نہایت غور سے اس لکڑی کے ڈبے کو دیکھ لیں، اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے نکالا تھا۔ چنانچہ سب نے اس بکس کو خوب غور سے دیکھ لیا۔ یہ ایک معمولی بکس تھا جس میں صرف ایک خانہ اندر سے نکلتا تھا۔ پھر جادوگر نے کہا۔ "اب خواتین میں سے کوئی اپنی موتیوں کی مالا صرف تھوڑی دیر کے لئے دے دیں"۔ مہاراجہ خود اپنی جگہ سے اٹھے اور رانی صاحبہ کی مالا لے کر جادوگر کو دے دی۔ جادوگر نے یہ مالا دونوں ہاتھوں میں لے کر سر سے اوپر بلند کی اور سلام کے لئے راجہ صاحب کے سامنے جھک گیا۔ اِس عرصہ میں تمام حاضرین نے یہ ہار اچھی طرح دیکھ لیا جس کے بڑے بڑے موتیوں کی آب پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ جادوگر نے نہایت صفائی کے ساتھ یہ ہار بکس کے اندر بند کر دیا اور ایک لمحہ کے بعد بکس کھول کر خالی بکس سب حاضرین کو دکھایا۔ سب نے اچھی طرح اپنی تسلی کر لی۔ بکس کے اندر سے کچھ برآمد نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر رانی صاحبہ بہت آزردہ ہوئیں اور جلسہ سے رخصت ہونے کے لئے کھڑی ہو گئیں۔ خود

راجہ صاحب اور تمام حاضرین بھی سخت پریشان نظر آنے لگے۔ کیونکہ ہار آٹھ دس ہزار روپے سے کم کا نہ تھا۔ جادوگر نے باآواز بلند کہنا شروع کیا۔ "شاید آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے مالا جیسی قیمتی چیز کھو دی۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو موکل چیزوں کو اُڑا لے جاتے ہیں وہی اُن کو واپس بھی لا سکتے ہیں۔ دیکھئے ذرا اُستاد کی تربیت کا کرشمہ دیکھئے۔" اس کے بعد جادوگر بڑے زور زور سے کچھ بے معنی منتر پڑھنے لگا اور بار بار اپنی آبنوس کی چھڑی سے اُس بکس کو چھونے لگا جو اس کے بائیں ہاتھ میں تھا کئی بار اس نے بکس کو زور زور سے ہلایا اور پھر سب کے سامنے بکس کھولا اور اندر سے مالا نکال کر بکس کو ایک میز پر رکھ دیا اور مالا کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر جادوگر مہاراجہ صاحب کے سامنے جھک گیا حاضرین نے بہت تالیاں بجائیں اور مہاراجہ صاحب نے مالا جادوگر سے لے کر رانی صاحبہ کے گلے میں پہنا دی۔ تماشہ ختم ہوا اور راجہ صاحب نے سَو روپے دے کر جادوگر کو رخصت کیا۔

کپتان صاحب بہت کچھ معذرت کے بعد راجہ صاحب سے رخصت ہوئے اور پھر ملنے کا وعدہ کر گئے۔

شام کے چھ بجے کپتان اپنی کوٹھی میں داخل ہوئے، راجپال سنگھ اور پورن سنگھ اور علی شیر کوٹھی کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ عباس علی نے اختصار کے ساتھ تمام واقعات دُہرائے جو گذشتہ چوبیس گھنٹے میں۔

پہنچ آچکے تھے اور آخر میں ایک لفافہ جیب سے نکال کر راجپال سنگھ کو دیا اور کہا۔ "فی الحال اس کو حفاظت سے رکھو جب واقعات سے ذرا مہلت ملے گی تو اس کو دیکھیں گے، بڑے کام کی چیز معلوم ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر عباس علی اپنے تینوں ساتھیوں کو ہمراہ لے کر اپنے کمرے میں گیا۔ کمرے کے تمام دروازے بند تھے اور مکان پر خوفناک سکوت چھایا ہوا تھا جس کو عباس علی خاں نے فوراً محسوس کیا۔ نوکروں میں سے کوئی موجود نہ تھا اس لئے ان لوگوں کو خود ہی تمام دروازے اور کھڑکیاں کھولنی پڑیں۔ ان لوگوں نے محسوس کیا کہ کمرے میں کسی ہلکی قسم کی بُو موجود تھی۔ خیال ہوا کہ کمرہ بند رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہو گی۔ تینوں اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے عباس علی نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "صرف آدھا کام ہوا ہے۔ جب تک سلطانہ ان لوگوں کی قید میں ہے ہم ہرگز محفوظ نہیں ہیں اب شام کے واقعہ نے کچھ نئے شبہات پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ لفافہ جو میں نے تم کو دیا ہے اور مجھے لارنس کے مکان کے بالائی کمرے میں میز کی دراز سے دستیاب ہوا ہے بہت جلد اس کا غائب ہو جانا ان لوگوں پر ظاہر ہو جائے گا اور وہ اس کے لئے بے چین ہوں گے۔ اس لئے راجپال سنگھ اس کو بہت حفاظت سے رکھ . . . . . نا . . . . ہوں . . . . ہوں"

کہتے کہتے عباس علی خاں کا سر آگے کو جھک گیا اور صوفے سے ایک طرف ڈھلک کر وہ خراٹے لینے لگا۔ اس کے دونوں ساتھی اس سے پیشتر ہی سو چکے تھے۔ کچھ دیر کے بعد ایک روشندان کھلا اور بند ہو گیا پھر کسی نے

چھت پر سے اشارہ کیا اور ایک موٹر جو کچھ دیر سے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر کھڑی انتظار کر رہی تھی آگے بڑھی اور کوٹھی کے اندر داخل ہوئی۔ چھت پر سے بھی آدمی نیچے اترا اور نہایت احتیاط کے ساتھ عباس علی خاں کو ایک برقعہ اڑھا کر موٹر کی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر پردے ڈال دیئے اور موٹر روانہ ہوئی

چوتھا باب

رات کے دس بج چکے ہیں ایک موٹر مسٹر لارنس کی کوٹھی واقع پرانی چھاؤنی دہلی کے سامنے آکر رکی اور اندر سے ایک سگنل ہوتے ہی آہستہ آہستہ کوٹھی کے اندر داخل ہوئی۔ صدر دروازے پر لارنس اور کنور سین دونوں کھڑے گویا اس موٹر ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ موٹر رکتے ہی دونوں نے ہاتھ پکڑ کر بیہوش عباس علی خاں کو موٹر سے نکالا اور دونوں طرف سے ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے کمرے کے اندر لائے اور فرش پر ڈال دیا پھر دروازے بند کر کے دونوں نے دو موٹے موٹے رسّوں سے اُس کو خوب جکڑ کر باندھ دیا حتیٰ کہ بجز سر اور چہرے کے اُس کے جسم کا کوئی حصہ رسّے سے کھلا نہ رہا اور تمام جسم تختہ بن گیا۔ پھر اُسے پکڑ کر دونوں اُوپر لے گئے اور ایک طرف فرش پر ہی ڈال دیا اور دو آدمی نگراں مقرر کئے جن کو لارنس نے یہ ہدایت کی کہ جس وقت عباس علی کو ہوش آئے فوراً اطلاع کی جائے۔ اس کے بعد لارنس اور کنور سین نیچے کے کمرے میں آئے اور

مشورہ کرنے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد اطلاع آئی کہ عباس علی ہوش میں آگیا ہے کنور سین نے اشارہ کیا اور لارنس ایک چمڑے کا ہنٹر لے کر اوپر گیا اور عباس علی کو آنکھیں کھولے دیکھ کر گالیاں دے کر اور دھمکا کر پوچھنے لگا۔ "قاسم سیٹھ کہاں ہے؟"

عباس علی نے ہوش میں آکر خود کو رسّوں میں جکڑا ہوا پایا اور کمرے کو دیکھ کر پہچان لیا۔ وہ لارنس اور کنور سین کے آنے کی توقع ہی کر رہا تھا کہ لارنس اُس کے سامنے آیا۔ عباس علی نے اُس کی بکواس کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ وہ سوچنے لگا کہ وہ کیونکر یہاں آیا۔ اُس کو یاد آیا کہ وہ اپنے کمرے میں دوستوں کے پاس بیٹھا ہوا نہایت اہم اُمور پر مشورہ کر رہا تھا کہ دفعتہً نیند آگئی اُسی حالت میں وہ زبردستی یہاں لایا گیا۔ یقیناً کمرے میں جو بدبو اُس نے محسوس کی تھی ضرور کسی خواب آور گیس کی تھی جو اُس کی غیر موجودگی میں کسی روشندان کے ذریعہ کمرہ کے اندر پھیلائی گئی ہوگی۔

لارنس نے جواب نہ پایا اور غصہ سے بیتاب ہو کر زور سے تین چار ہنٹر پے درپے عباس علی کے مُنہ پر مارے جس سے عباس علی کا مُنہ سوج گیا اور سخت تکلیف ہوئی لیکن عباس علی نے اُف تک نہ کی یہ دیکھ کر لارنس سخت متعجب اور پریشان ہوا مگر اُس کو ایک نئی ترکیب سوجھی اور وہ فوراً نیچے گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک حسین دوشیزہ کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔

لارنس (لڑکی کو مخاطب کر کے) مس سلطانہ! آپ ہیں کپتان عباس علی

خاں صاحب - ہمارے معزز مہمان سے ملاقات کیجئے۔" یہ کہہ کر لارنس نے ایک ایسا قہقہہ لگایا جس سے اُس کی فطرت کی خباثت اور شیطنت ظاہر ہوتی تھی سلطانہ کے مُنہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گئی گویا بس چلتا تو زمین میں سما جاتی۔ اُس نے چاہا کہ وہ اپنی ساری کے آنچل سے اپنا مُنہ چھپا لے، لیکن لارنس نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس زور سے مروڑے کہ درد و تکلیف سے معصوم لڑکی نے جس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے زور سے دانت بھینچے مگر پھر بھی چیخ نکل گئی۔ اس وقت عباس علی خاں کی جو کیفیت تھی وہ ناقابل بیان ہے۔ اگر کسی طرح وہ آزاد ہو جاتا تو لارنس کی شامت ہی آجاتی۔ وہ اس بُری طرح جھنجوڑتا جیسے چوہے کو بلی مگر افسوس وہ بے بس تھا تاہم اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس نے غصہ سے چیخ کر کہا۔" او ذلیل کمینے ایک بے بس لڑکی کے ساتھ یہ ظلم کر کے کیوں اپنی نامردی کا ثبوت دیتا ہے۔ آخر بے قصور . . . . . ."

لارنس نے سلطانہ کو چھوڑ کر عباس علی کے مُنہ پر ایک اور ہنٹر رسید کیا اور پھر مسلسل ایک درجن ضربیں اور لگائی ہوں گی۔ ہر ضرب پر سلطانہ تڑپ کر چاہتی تھی کہ مداخلت کرے مگر ہر بار نسوانی حجاب و حیا اس کو اس بات سے باز رکھتی تھی کہ وہ لارنس جیسے خبیث کو ہاتھ لگائے یا بیچ میں آجائے اور ہر بار وہ آگے بڑھ بڑھ کر پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ وہ اس مکان سے خوب واقف ہو چکی تھی اور جانتی تھی کہ اس کمرے میں چیخ و پکار کی آواز باہر نہیں جاسکتی پھر بھی کئی بار وہ مدد کے لئے بے اختیار چلا اُٹھی۔ آخر اُس نے

ہمت کر کے کُرسی اُٹھائی اور چاہتی تھی کہ لارنس کے سر پر دے مارے
مگر لارنس نے دیکھ لیا اور کُرسی چھین کر ایک رسّی سے اُس کے دونوں ہاتھ کس کر
باندھ دئیے اور پھر ایک کرسی پر بٹھا کر ایک رسّے سے اُس کو جکڑ دیا اور اُس
کے بعد نہایت وحشیانہ طریقے سے عباس علی پر ہنٹر برسانے لگا۔ عباس علی
خاموش تھا۔ سلطانہ بے قرار تھی مگر بے بس۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری
تھے۔ جب لارنس مارتے مارتے تھک گیا اور عباس علی اور سلطانہ دونوں
نے قاسم سیٹھ کا پتہ نہ بتایا تو مجبور ہو کر ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر
خود نیچے چلا گیا۔ اگرچہ سلطانہ کو خود یہ معلوم نہیں تھا کہ اُس کے باپ کا کیا حشر ہوا
لیکن عباس علی کو اس حالت میں دیکھ کر اُس کو یہ یقین ہو گیا کہ عباس علی کی مدد
سے وہ کسی محفوظ مقام پر پہنچ چکا ہے اور عباس علی اسی جرم کی پاداش میں
مظالم سہہ رہا ہے۔ سلطانہ جب یہ سوچتی تھی کہ عباس علی نے اُس کی وجہ
سے اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے تو وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو
ملامت کرتی تھی۔ لارنس کے چلے جانے کے بعد وہ چاہتی تھی کہ عباس علی
سے معافی مانگے مگر اُس کے جذبات میں ایک ایسا طوفان بپا تھا کہ آنسو
تھمتے ہی نہ تھے اور منہ سے آواز تک نہ نکلتی تھی مگر عباس علی باوجود اتنی
زد و کوب کے نہایت سکون کے ساتھ موجودہ صورتِ حال پر غور کر رہا تھا
کم از کم اُس کا دماغ بالکل صاف تھا۔ اگرچہ سلطانہ کی موجودگی سے آج کپتان
کے جذبات میں ایک خفیف سی لہر اُٹھ رہی تھی تاہم اس مختصر وقت کو غنیمت
جان کر اُس نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

کپتان۔ "تم ہرگز نہ گھبراؤ۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا۔ تمھارے والدان ظالموں کے پنجے سے محفوظ اور خیریت سے ہیں۔ دیکھو رونے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ہمت نہ ہارو۔ دل مضبوط کرو۔ جو واقعات ان دو دن میں پیش آئے ہیں وہ مختصر بیان کر دو شاید کوئی کام کی بات مل جائے . . . .
ہاں ہاں کہہ دو خاموش رہنے کا وقت نہیں ہے"۔

سلطانہ (بھرائی ہوئی آواز میں) "مجھے سخت افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اس مصیبت میں پھنسا دیا"۔

عباس علی۔ "ہرگز نہیں۔ تم نے بہت اچھا کیا لیکن تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ جس کنور سین کے واقعات تم نے اخبارات میں دیکھے ہیں، اسی خوفناک مجرم کی سازش میں تم اور تمھارے والد گرفتار ہو گئے تھے کنور سین ہی اس دفعہ نواب محی الدین مرزا کے بھیس میں ہے۔ لارنس اگرچہ ایک عیار مجرم ہے لیکن اس سے کچھ زیادہ اندیشہ نہیں۔ کنور سین کے سامنے وہ محض طفلِ مکتب ہے"۔

سلطانہ۔ "آج صبح ہی سے ان لوگوں کا برتاؤ مجھ سے بہت ہی سخت ہے۔ میری بوڑھی آیا غائب ہے اور انجم آرا کو بھی میں نے کل شب کے بعد سے نہیں دیکھا۔ آج دن بھر میں نے رو رو کر گذارا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ ایک نوکر نے مجھ سے کہا کہ تمھارے والد آ گئے ہیں اور تمھیں بلاتے ہیں۔ میں جانتی تھی کہ یہ سب دھوکا ہے، مگر سوائے ساتھ چلے آنے کے اور کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔ اس کوٹھی میں آ کر لارنس نے

بتایا کہ آپ اس کمرے میں میرے والد کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ میرے ایسے ہاتھ پیر پھولے ہوئے تھے کہ جب مجھے یہاں آنے کے لئے کہا گیا تو میں یہاں چلی آئی۔"

عباس علی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ نیچے سے کچھ آوازیں آنے لگیں جن کو عباس علی غور سے سننے لگا۔

ایک نئی آواز۔ "جی ہاں تو میں قیمت ابھی تو ادا نہیں کر سکتا میرا آدمی کلکتہ گیا ہوا ہے آپ کی چیز لے گیا ہے آڑھتی سے سودا کرے گا پھر مجھے تار دے گا۔ تب آپ کی رقم چکا سکتا ہوں۔ اس سے پہلے تو مشکل ہے۔"

لارنس کی آواز۔ "مشکل کیا معنی؟ چیز تم نے خرید لی ٹھری ہے پھر جو کچھ تم سے ٹھیر چکا ہے وہ کیوں نہیں دے دیتے؟ آڑھتی سے مجھے کیا غرض۔ تم جانو تمھارا آڑھتی جانے۔"

نئی آواز۔ "غرض کیوں نہیں۔ میں جب تک یہ نہ دیکھ لوں کہ مال ٹھکانے لگ گیا آپ کو دام کیسے دے دوں کوئی گاجر مولی کا سودا تو ہے نہیں۔"

لارنس۔ "یہ آج تم کو کیا ہو گیا ہے۔ اگر نہیں لینا تھا تو پہلے ہی کیوں نہ انکار کر دیا۔ ہم کچھ اور بندوبست کر لیتے۔ یہ تو صریح بے ایمانی ہے۔"

نئی آواز۔ "جی ہاں ایک آپ ہی تو بڑے ایماندار ہیں۔"

لارنس۔ "بس جی روپے نہیں دیتے تو چیز واپس کرو"۔
نئی آواز۔ "کیسی چیز۔ کس کو دی تھی۔ تم جیسے تین سو ساٹھ چرا ڈالے
آپ بڑے شاہ ہیں جو ہمیں چور بتاتے ہیں"۔
لارنس (غیض و غضب سے چیخ کر) "ہار واپس کرو، ورنہ ابھی
جان نکال دوں گا"۔

اس کے بعد بہت زیادہ شور و غل کی آوازیں سنائی دیں جن میں
کنور سین کی آواز بھی شامل تھی جو معاملہ کو رفع دفع کرنے میں کوشاں معلوم
ہوتا تھا۔ مگر دونوں اس قدر جوش میں تھے کہ کسی طرح سمجھوتہ نہ ہوتا تھا
ایک کو روپیہ لینے پر اصرار تھا، دوسرے کو اس سے انکار تھا۔ اس گفتگو میں
عباس علی کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اجنبی بولنے والا اینڈرسن اینڈ کمپنی جوہریان
کناٹ پلیس نیو دہلی کا منیجر جیکب ہے جس کو مہارانی صاحبہ بہرام پور کا
بیش قیمت ہار لارنس نے فروخت کرنے کے لئے دیا تھا لیکن اس راز سے
جیکب بھی واقف تھا کہ لارنس مصنوعی موتیوں کے بنانے میں کمال رکھتا ہے
اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ لارنس نے مدراسی جادوگر کا بھیس بھر کر راجہ صاحب
کی کوٹھی پر کھیل دکھایا اور اپنا جعلی ہار رانی صاحبہ کے اصلی ہار سے بدل لایا چونکہ
جیکب نے اس راز کا پتہ لگا لیا تھا اس لئے افشائے راز کی دھمکیاں دے کر
چاہتا تھا کہ اس شکار کا نصف حصہ حاصل کرے۔ اُدھر کنور سین کو لارنس کے
ساتھ اس خاص معاملہ میں کوئی ہمدردی نہ تھی۔ کیونکہ اگرچہ اپنے فطری غرور
کے باعث اُس نے لارنس سے اس شکار کا حصہ طلب نہیں کیا لیکن وہ سمجھتا تھا

کہ لارنس کا فرض ہے کہ ہار کی قیمت میں سے نصف رقم وہ کنور سین کو پیش کرے۔ برخلاف اس کے اسی شام کو لارنس کنور سین کے سامنے اپنی دوں فطرتی اور لالچ کے باعث کچھ اس قسم کا اظہار کر چکا تھا کہ اِس رقم سے کنور سین کو کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے اور سیٹھ قاسم کے معاملہ میں جو پچیس لاکھ روپیہ ہاتھ لگنے والا تھا اس میں وہ نصف کا شریک ہوگا۔ اس بات نے کنور سین کے دل میں لارنس کے خلاف ایک نفرت پیدا کر دی تھی اور یہ نیا قضیہ جو درپیش آیا اس سے وہ ایک حد تک خوش تھا۔ اِس قضیہ کے طے ہونے میں دو گھنٹے سے زیادہ صرف ہو گئے معاملہ پھر بھی کسی طرح سُلجھتا ہوا معلوم نہ ہوتا تھا۔

ادھر عباس علی نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ کان اس معاملہ کی طرف رکھے مگر آہستہ آہستہ سرک کر وہ سلطانہ کی کرسی کے قریب ہو گیا اور دانتوں سے اُس کے ہاتھوں کے بند کھول دئے۔ ہاتھ کھلتے ہی سلطانہ نے بہت جلد اپنے آپ کو آزاد کر لیا اور عباس علی کی ہدایات کے مطابق اُس کے ہاتھ بھی کھول دئے۔ پھر دونوں نے مل کر باقی جسم کی گرہیں بھی کھول دیں۔ عباس علی نے چاہا کہ کوئی کھڑکی کھل سکے مگر اس میں کھٹکا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اِس لئے پھر مجبوراً اُس نے روشندان کا پُرانا راستہ اختیار کیا۔ رسّیوں کو باندھ کر ایک لمبی سیڑھی بنائی اور میز پر کھڑے ہو کر اس سیڑھی کو روشندان کے دو پایوں سے مضبوط باندھ دیا اور پہلے سلطانہ کو اس رسّی پر چڑھایا۔ سلطانہ کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا اور اُس کو اپنی زندگی اِن رسّیوں

کی سیڑھی تو ایک طرف کبھی بانس کی سیڑھی پر بھی چڑھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا
یہ منزل بڑی کٹھن تھی لیکن عباس علی کی مدد سے سلطانہ چھت پر پہنچ ہی گئی
اور تھوڑی دیر میں عباس علی رسّوں سمیت اُس کے برابر کھڑا تھا عباس علی
نے پھر ایک بار روشندان سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ کمرہ خالی تھا اور سب سے
نیچے کی منزل سے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں بدستور آرہی تھیں۔ اب اس
چھت سے زمین بائیس تیئس فٹ نیچی تھی۔ خود عباس علی کے لئے رسّوں
کی مدد سے نیچے اُتر جانا کچھ مشکل نہ تھا لیکن سوال سلطانہ کا تھا عباس علی
نے رسّے میں گرہیں لگا کر ایک چھینکا سا بنایا اور سلطانہ کو اس کے اندر بٹھا دیا
سلطانہ نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ عباس علی نے اُس کے کان میں ہمت
دلانے والے الفاظ کہے۔ رسّوں کا ایک سرا روشندان سے مضبوط باندھ کر
اور رسّے کے بیچ میں ایک ایک فٹ کے فاصلہ پر گرہیں لگا کر اور اللہ کا نام لے کر
چھینکے کو نیچے لٹکایا۔ خود عباس علی کو یہ خطرہ تھا کہ اگر کسی کو شبہ ہو گیا تو بنا بنایا
کام بگڑ جائے گا۔ مگر خوش قسمتی سے رات نہایت تاریک تھی اور آسمان پر
کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ پشت کی طرف کی تمام کھڑکیاں
بند تھیں اور کوئی روشنی دُور دُور تک نظر نہ آتی تھی۔ عباس علی خاں نے پہلے تو
سلطانہ کو نیچے پہنچایا اور پھر خود تیزی کے ساتھ نیچے پہنچا اور چھینکے میں سے
سلطانہ کو نکال کر اور ہاتھ پکڑ کر کوٹھی کے پشت کی طرف بھاگا۔ کوٹھی کے
چاروں طرف معمولی آہنی جنگلہ تھا اور اس میں خار دار تار کھنچے ہوئے تھے
پشت کی طرف جو چھوٹا دروازہ تھا وہ ان دونوں سے کسی قدر فاصلہ پر تھا

اور کوٹھی کے ایک کمرے کی روشنی اس دروازے تک پہنچتی تھی اِس لئے
عباس علی نے سوچا کہ دروازے سے گذرنا خطرے سے خالی نہیں، اِس لئے
وہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں تاروں کے بیچ میں سے گذر جائیں۔ لیکن دفعتہً
غل مچ گیا۔ "پکڑو پکڑو۔" اور ایک آواز یہ بھی سنائی دی۔ "کرنٹ" عباس علی
نے جلدی سے سلطانہ کو تاروں کے اُوپر سے نکال دیا اور خود پلٹ کر دیکھا
تو ایک شخص نے دوڑ کر پیچھے کے دروازے کا آہنی پھاٹک بند کر دیا۔ اس
کے بند ہوتے ہی تمام آہنی تار تپے ہوئے لوہے کی طرح سُرخ ہو گئے۔ اب
عباس علی کی سمجھ میں آیا کہ "کرنٹ" کا یہ منشا تھا کہ دروازہ بند کر کے برقی حلقہ
مکمل کر دو۔ تاکہ بجلی کی رَو تمام تاروں میں دوڑ جائے اور راہِ فرار مسدود
ہو جائے۔ عباس علی نے آواز سے سلطانہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "سیدھی بھاگی
ہوئی چلی جاؤ اور سڑک آنے پر بائیں ہاتھ کو مڑ جانا۔"

سلطانہ سخت پریشان ہوئی مگر عباس علی پر اس کو اتنا بھروسہ تھا کہ
وہ سیدھی بھاگی ہوئی چلی گئی۔ اُدھر عباس علی نے اندھیرے میں ایک شخص کو
اپنی طرف آتے دیکھا۔ عباس علی نے اپنے جاپانی اُستاد اراگی سے اِس
فن کو خوب سیکھ رکھا تھا کہ اندھیرے میں بغیر آواز کے نہایت تیزی سے
ساتھ حرکت کر سکے اُس نے آہستہ سے ایک سیٹی بجائی اور تیزی سے اپنی
جگہ بدل کر ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔ جب وہ شخص آگے بڑھا تو عباس علی
اپنی کمیں گاہ سے نکل کر اُس شخص کے سر پر موجود تھا اور اُس نے اِس زور
سے ایک مُکا اُس شخص کی گردن پر مارا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ کپتان نے

جھک کر کارتوس کی پٹی اُس کی گردن سے نکالی اور پستول اپنے قبضہ میں کیا
اُسی وقت آٹھ دس آدمی اس طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ عباس علی
نے اُس بیہوش آدمی کو ایک جھاڑی میں اُلجھا کر سیدھا کھڑا کر دیا اور سیٹی بجائی
یہ لوگ اِس طرف بھاگے۔ عباس علی دُور نکل چکا تھا، مگر انہوں نے جھاڑی
کے قریب ایک آدمی کو کھڑا دیکھ کر اُسے مارنا شروع کر دیا۔ عباس علی خاں
نے فائر کیا اور اُن میں سے ایک گولی کھا کر گرا۔ یہ لوگ حیران ہو گئے کہ
عباس علی کو تو وہ مار رہے تھے یہ فائر کہاں سے ہوا۔ اس طرح تھوڑی دیر
میں ہر گوشہ سے عباس علی نے فائر کئے جس سے کوٹھی کے محافظوں نے
یہ خیال کیا کہ عباس علی کے بہت سے ساتھی مسلح اس کوٹھی کے احاطے میں
موجود ہیں۔ ہر شخص لالٹین لے کر کوٹھی سے نکلتا ہوا ڈرتا تھا کیونکہ اتنی بڑی جگہ
میں اور ایسے سخت اندھیرے میں لالٹین لے کر نکلنے والا تو دوسروں کو نظر
آسکتا تھا لیکن خود لالٹین والا کسی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ ایک بیوقوف
نے یہ جرأت کی فوراً عباس علی نے اُس کو نشانہ بنایا۔ اب تو ہر طرف سے بھاگڑ
پڑ گئی اور لوگ کوٹھی سے باہر نکلتے ہوئے ڈرنے لگے۔ کنور سین اور لارنس
نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ عباس علی اور اُس کے ساتھی بجلی کے تاروں سے
باہر نہیں جا سکتے اس لئے اطمینان سے غور کر کے اُن کو پکڑنے کی تدبیر کرنی
چاہئے اور احتیاطاً کچھ لوگ اِدھر اُدھر حفاظت کے لئے مقرر کر دیئے گئے
لارنس اور کنور سین سخت پریشان تھے کہ جیکب کے سامنے یہ ایک نیا واقعہ
پیش آگیا۔ اور اب دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سوچ رہے تھے کہ کسی طرح

جیکب کو جانے نہ دیا جائے اور کسی ایسی تدبیر سے اُس کو موت کے گھاٹ اُتار اجائے کہ دنیا اس کو خودکشی یا حادثہ تصور کرے مگر ایسا کرنے میں لارنس کو اپنے ہار کا فکر تھا۔ نیز وہ خوب جانتا تھا کہ جیکب جیسا عیار آدمی بغیر کسی انتظام کے یہاں ہرگز نہ آیا ہوگا اور بالخصوص جبکہ وہ بے ایمانی کرنے اور لڑنے جھگڑنے کے منصوبے باندھ کر آیا ہے۔ جیکب کی موجودگی کی وجہ سے لارنس اور کنورسین باہم مشورہ بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس واقعہ نے جیکب کو اور زیادہ شیر کر دیا تھا اور وہ نہ صرف اپنی بات کو منوانے پر اڑا ہوا تھا بلکہ اس نئے راز کو بھی دھمکیاں دے دے کر معلوم کرنا چاہتا تھا جس کا تعلق اس نئے واقعہ سے تھا۔ غرض واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ کچھ بنائے نہ بن پڑتی تھی۔ اُدھر عباس علی کو یہ فکر تھی کہ اندھیری رات میں غریب سلطانہ کا کیا حشر ہوگا۔ ایک اور مصیبت یہ آئی کہ نہایت زور شور سے بارش شروع ہوگئی۔ ہوا نہایت تیز چلنے لگی اور بادل کی گرج اور بجلی کی چمک نے پریشان حال سلطانہ کو بالکل مخبوط الحواس بنا دیا۔ وہ دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔ اُسے دائیں اور بائیں کا کچھ ہوش نہ تھا۔ سڑک پر پہنچ کر جدھر کو مُنہ اُٹھا اُدھر ہی کا رُخ کر لیا اُس نے ایک موٹر آتے ہوئے دیکھی تو بیچ سڑک میں کھڑی ہوگئی۔ غالباً وہ چاہتی تھی کہ موٹر والے کسی امن و حفاظت کی جگہ پر اُسے پہنچا دیں کیونکہ اب اُس کی طاقت جواب دے چکی تھی پاؤں لہولہان تھے۔ سر کے بال بکھر گئے تھے ساڑھی کا آنچل سر سے گر کر کچھ عجیب طرح سے سینے اور گردن کے گرد لپٹ گیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے

چہرے پر وحشت برس رہی تھی، مُنہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ تمام جسم خوف
و تکان سے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ڈرائیور یہ صورت دیکھ کر خوف زدہ
سا ہو گیا مگر اُس نے خوش قسمتی سے عین موقع پر بریک لگا کر گاڑی روک لی
ڈرائیور کے علاوہ موٹر کے اندر چار لحیم شحیم آدمی بیٹھے تھے جن کے چہروں سے
شہدہ پن ٹپکتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شراب کے نشہ میں مست ہیں
گاڑی کے رو کنے سے یہ سب چونک پڑے اور گالیاں بکتے ہوئے بعض
نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کی وجہ پوچھی اور بعض نے باہر جھانکا اور ایک
نوجوان عورت کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر سب کے سب گاڑی سے
نکل پڑے۔ سلطانہ نے اُن کی صورت اور وضع کو دیکھ کر بھاگنا چاہا مگر اُس
کی تمام قوتیں سلب ہو گئیں اور وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی یہ لوگ اُسے
اُٹھا کر موٹر میں ڈالنا ہی چاہتے تھے کہ پیچھے سے ایک اور موٹر آ پہنچی جس میں
عباس علی کے یار علی شیر، راجپال سنگھ، اور پورن سنگھ سوار تھے۔ باوجود تاریکی
بارش اور ہوا کے اُنہوں نے اپنے سے اگلی موٹر کو ٹھیرتے آدمیوں کو اُترتے
اور کسی کو زمین سے اُٹھاتے ہوئے دیکھ کر یہ خیال کیا کہ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے
اس لئے یہ موٹر روک کر تینوں اُتر پڑے اور مدد کرنی چاہی آگے بڑھ کر
راجپال سنگھ نے پوچھا۔ "کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے کیا موٹر بگڑ گئی ہے؟"
پہلی موٹر کے آدمیوں میں سے ایک۔ "جاؤ جی اپنا کام کرو۔ آئے
وہاں سے۔" (گالی)

راجپال سنگھ (اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہو کر) "بھئی عجیب

وحشی لوگ ہیں ہم تو مدد کے لئے آئے (علی شیر کے کان میں) معاملہ مشتبہ معلوم ہوتا ہے ہمیں اُدھر جانا ہے ورنہ پیچھا کرنا چاہیئے تھا"

علی شیر نے بڑھ کر اُس آدمی کی گُدی پر ایک مُکا رسید کیا جس نے اُسے گالی دی تھی اور جو سلطانہ کو موٹر میں ڈال کر خود بھی موٹر میں سوار ہونا چاہتا تھا۔ مُکا لگتے ہی اُس شخص نے پلٹ کر لڑنا شروع کیا اور اُس کے چاروں ساتھی لڑائی میں شریک ہو گئے بارش کی کثرت اور ہوا کی تیزی سے اُس سُنسان مقام پر کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی اور یہ آٹھوں آدمی ایک خوفناک جنگ میں مشغول تھے۔ پانچوں بدمعاش لڑنے میں بہت مشاق تھے۔ پہلے مکے بازی کا مقابلہ ہوتا رہا لیکن اِن میں سے ایک نے جیب سے ایک بہت بڑا چاقو نکال کر علی شیر پر حملہ کیا۔ علی شیر نے پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر وار خالی دیا اور چاقو اُچٹتا ہوا خود اسی بدمعاش کے ایک ساتھی کی ران میں لگا۔ تاہم رفتہ رفتہ علی شیر اور اُس کے ساتھی دبتے چلے جاتے تھے کہ دفعتہً ایک موٹر لاری بھی اس طرف آنکلی اُس کو دیکھ کر علی شیر نے خوشی کا نعرہ لگایا اور بدمعاش بھاگ نکلے مگر موٹر وہیں چھوڑ گئے علی شیر نے لاری کو روک لیا۔ اُس میں مسٹر جیفرسن سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی ڈی ایک سب انسپکٹر اور چوبیس کانسٹیبل سوار تھے۔ علی شیر (مسٹر جیفرسن سے ہاتھ ملاتے ہوئے) "آپ نے بڑی عنایت کی کہ میرے عریضہ پر آپ نے خود تکلیف کی، مگر معاملہ نہایت اہم تھا۔ مجھے قطعی امید ہے کہ آپ کے دوست عباس علی خاں کسی انتہائی مصیبت میں گرفتار ہیں اور اُن کا سراغ صرف

اِس کوٹھی سے نکل سکتا ہے جس کا پتہ میں آپ کو لکھ چکا ہوں۔"

مسٹر جیفرسن "اچھا چلئے۔ مگر آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے تھے؟"

علی شیر "ہم یہاں ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ پانچ بدمعاش جو اس موٹر میں سوار رات کے ایک بجے اِس طوفان و بارش میں اِدھر سے گذر رہے تھے ضرور اُن کا تعلق کنور سین سے ہے۔ ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ کوئی حادثہ پیش آگیا اس لئے اُن کی مدد کے واسطے ٹھیرے تھے لیکن اُن کے دل میں چور تھا اس لئے ہم سے لڑنے اور گالیاں دینے لگے۔ لڑائی ضرور خوفناک صورت اختیار کر لیتی اگر آپ نہ آتے۔ آپ کو دیکھ کر یہ لوگ بھاگ نکلے ہیں اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ چور اُچکّے ہی ہوں گے، ورنہ بھاگنے کے کیا معنی ہیں؟"

اِدھر ان لوگوں کی توجہ تو رہی باتوں کی طرف اُدھر بدمعاشوں میں سے وہ شخص جس کی ٹانگ پر زخم آیا تھا چپکے چپکے زمین پر رینگتا ہوا اپنی موٹر کے قریب تک آیا اور ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کر موٹر اسٹارٹ کر کے پوری رفتار سے چھوڑ دی۔ سٹارٹ کرتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ نے دیکھ لیا اور ڈرائیور کو پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ اِدھر علی شیر اور اُس کے دونوں ساتھی اپنی موٹر میں جلدی سے سوار ہوئے اور علی شیر نے اپنی کار لاری کے پیچھے ڈال دی تھوڑی ہی دور جا کر لاری بدمعاشوں کی موٹر کے قریب آگئی اور سپرنٹنڈنٹ نے موٹر کے پچھلے ٹائر کو نشانہ بنا کر تین فائر کئے ٹائر پھٹ گئے اور موٹر کھڑی ہو گئی - ڈرائیور کود کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن ایک

سپاہی نے لاری سے کود کر اُس کا تعاقب کیا اور تھوڑی دیر میں پکڑ کر لے آیا
اور لاری میں ٹھونس دیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے ایک دستے کے ساتھ بدمعاشوں
کی موٹر علی شیر کے موٹر کے پیچھے بندھوا دیا اور سب علی شیر کی ہدایت کے مطابق
مسٹر لارنس کی کوٹھی کے صدر دروازے سے پچاس قدم اِدھر رُکے پانچ
سپاہی لاری اور موٹر کی حفاظت کے لئے چھوڑے۔ باقی نے سپرنٹنڈنٹ
کے حکم سے کوٹھی کا محاصرہ کر لیا۔ یہ دیکھ کر سب کو تعجب ہوا کہ بارش کے
باوجود کوٹھی کے احاطے کا آہنی جنگلہ اندھیرے میں آگ کی طرح دہک رہا ہے
سپرنٹنڈنٹ نے صدر دروازے پر ایک ایک لکڑی کا دروازہ دو ستونوں
کے درمیان بند دیکھا اور ایک چور لالٹین سے اس دروازے کو اچھی طرح
دیکھ کر جیب سے ایک آلہ نکالا جو ایک بہت لمبی قینچی سے مشابہ تھا۔ جس کی
دستیاں بلور کی تھیں۔ اِس آلے کی مدد سے سپرنٹنڈنٹ نے دروازے
کے دونوں کواڑوں میں جو حلقہ پڑا ہوا تھا اُس کو کھول دیا کرنٹ بند ہو گئی
دروازہ کھولا گیا۔ باوجود تاریکی کے عباس علی خاں نے یہ تبدیلی محسوس کی مگر
وہ اپنی کمیں گاہ سے نہ ہلا۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ کوٹھی کے گرد کچھ شکلیں
متحرک ہیں۔ تھوڑی دیر میں پچھلا دروازہ کھلا اور کچھ لوگ اندر آئے۔ اُن
پر جو روشنی کی جھلک پڑی تو عباس علی نے پہچان لیا کہ پولیس آ پہنچی اور معاً
اس کا خیال علی شیر کی طرف گیا اور دل ہی دل میں وہ علی شیر کو بُرا بھلا
کہنے لگا۔ پولیس کا حلقہ تنگ ہوتا گیا اور اصل عمارت بالکل پولیس کے
قبضہ میں آ گئی۔ مگر عباس علی خاں پولیس کی آنکھوں میں خاک ڈال کر نہایت

اطمینان سے اُن کے حلقے میں سے گذر کر کوٹھی کے اندر داخل ہوا اور کئی کمروں میں سے ہوتا ہوا اُس کمرے میں پہنچا جس میں لارنس کنور سین اور حبیب یکجا بیٹھے اب بھی معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

عباس علی کو دیکھ کر کنور سین اور لارنس اس قدر متعجب ہوئے کہ کچھ دیر تک اُن کو اپنی نظر پر یقین نہ آیا مگر کنور سین نے آخر عباس علی کو مخاطب کر کے کہا۔ "عباس علی! آخر تمھیں یقین ہو گیا کہ تم کوٹھی سے باہر نہیں جا سکتے اور سلطانہ بھی صبح سے پہلے پہلے یہیں آ جائے گی۔"

عباس علی :- "جی بجا درست ارشاد ہوا۔ کنور سین تم کو معلوم ہونا چاہئے اور اگر تم کو نہیں معلوم تو بحیثیت ایک پُرانے دوست کے میں تمھیں اطلاع دینے آیا ہوں کہ پولیس نے اس کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور اب تم اس کوٹھی کے باہر نہیں جا سکتے۔"

کنور سین (قہقہہ لگا کر) "میاں صاحبزادے! ان گیدڑ بھبکیوں سے کام نہیں چل سکتا میں نے تم سے بارہا کہہ دیا ہے کہ تم میرے معاملات میں دخل نہ دیا کرو، ایک نہ ایک دن نقصان اُٹھاؤ گے۔ مجھے تمھاری جوانی پر ترس آ جاتا ہے۔ لارنس کے تحفے تو تم ابھی نہ بھولے ہو گے۔"

عباس علی :- "میں اس ذلیل مردک کو ہرگز اپنا مدمقابل نہیں سمجھتا ہاں تمھاری ذہانت اور دلیری کی ضرور تعریف کرتا ہوں۔ کاش یہ ذہانت و دلیری نیک کاموں کے لئے وقف ہوتی۔"

لارنس نے نوکروں کو طلب کرنے کے لئے گھنٹی بجائی، دروازہ کھلا

اور سپرنٹنڈنٹ، علی شیر، راجپال سنگھ، پورن سنگھ ہاتھوں میں پستول لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور اُن کے پیچھے تین سپاہی آئے جنہوں نے اشارہ پاتے ہی کنورسین، لارنس اور جیکب کو گرفتار کر لیا کنورسین عباس علی کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا جیکب اپنے ہونٹ چبا رہا تھا اور لارنس سپرنٹنڈنٹ کے قدموں پر گر کر اور رو رو کر کہہ رہا تھا کہ حضور میرا کچھ قصور نہیں۔ تھوڑی دیر میں ایک سپاہی بملا کو گرفتار کئے ہوئے اس کمرے میں لایا مگر اُس کے چہرے پر بھی ہرگز کسی قسم کا انتشار نہ تھا عباس علی کے قریب سے گذرتے ہوئے اُس نے آہستہ سے کہا "آپ کا شکریہ"

پانچواں باب

مذکورہ بالا واقعہ سے آٹھ روز بعد صبح کے ساڑھے سات بجے کپتان عباس علی خاں کی کوٹھی کے برآمدے میں کپتان عباس علی خاں اور اُن کے یارِ غار صاحبزادہ رحمت علی، راجپال سنگھ، پورن سنگھ اور علی شیر اور سیٹھ قاسم مع اپنی صاحبزادی سلطانہ کے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ نہایت پُر تکلف گفتگو ہو رہی ہے اور حال ہی میں جو واقعات پیش آئے ہیں اُن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ سیٹھ قاسم نے بیان کیا کہ کنورسین نے جو نواب محی الدین کے بھیس میں تھا اُن کو

اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ایک جعلی دستاویز پر دستخط کریں، اس دستاویز میں یہ لکھا تھا کہ سیٹھ قاسم نے نواب محی الدین مرزا سے پچیس لاکھ روپیہ قرض لیا ہے۔ انہوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تو کنور سین اور لارنس نے تشدد شروع کیا اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دیں اور ایک خوفناک آلے کے اندر بائیں ہاتھ کا انگوٹھا دبا کر اُس کا قیمہ کر دیا اور اس ظالمانہ تجربہ کو داہنے ہاتھ کے انگوٹھے پر بھی کرنا چاہتے تھے کہ عباس علی نے اِس مصیبت سے نجات دلائی۔ سیٹھ صاحب نے یہ بھی بیان کیا کہ ان ظالموں نے اُن کو کسی ایسی دوا کا انجکشن دیا کہ اُس کے اثر سے دماغ میں ایک دھواں سا بھر گیا۔ جب علی شیر اُن کو لے کر ہوائی جہاز میں قیصر گنج چلے گئے تو وہاں رحمت علی خاں نے اُن کا علاج قابل ڈاکٹر سے کرایا اور تین روز کے بعد اُن کے ہوش وحواس درست ہوئے۔ اُسی روز شام کو دہلی سے قیصر گنج خیریت کا تار پہنچا اور بلانے کا حکم۔ چنانچہ اُسی وقت رحمت علی خاں اور سیٹھ قاسم ڈاک سے روانہ ہوئے اور رات ہی کو دہلی پہنچ گئے اور سیٹھ قاسم نے اپنی بیٹی سے عباس علی خاں کی بے غرضانہ ہمدردی، ناقابل تقلید ایثار اور انتہائی دلیری کے واقعات سُن کر اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ سلطانہ کی شادی عباس علی سے کر دے عباس علی خاں نے اِس بات کو خوشی سے منظور کیا اور شادی ہوگئی۔

اُدھر جیکب، لارنس اور کنور سین اور بلا سب حوالات میں ہیں اور اُن کے خلاف مقدمہ دائر ہو چکا ہے۔ اُن پانچ بدمعاشوں میں سے جنہوں نے

سلطانہ کو اپنی موٹر میں ڈال لیا تھا ایک بدمعاش پکڑا بھی جا چکا تھا اور موٹر بھی پولیس کے قبضہ میں تھی اُس کے نمبروں سے پتہ لگ گیا کہ یہ جیکب کی موٹر تھی اور اس سے صاف یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ مقررہ وقت پر یہ لوگ جیکب کی اعانت کے لئے جا رہے تھے واقعات نے کچھ اور ہی صورت اختیار کر لی۔ جیکب کے مکان کی تلاشی ہوئی اور رانی صاحبہ بہرام پور کا ہار برآمد ہوا۔ واقعات پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے عباس علی خاں کا بیان ہوا۔ جس کے ساتھ انھوں نے ایک لفافہ عدالت کے سامنے پیش کیا جو اُن کو پہلی رات میں لارنس کی کوٹھی کے بالائی کمرے سے ملا تھا۔ اس لفافہ کے اندر رانی صاحبہ کے ہار کا فوٹو بالکل ہار کے برابر کھنچا ہوا رکھا تھا اور رانی صاحبہ کے ایک خادمِ خاص کا مختصر خط بھی تھا جس سے معلوم ہوا کہ وہ اس سازش میں شامل تھا۔ لارنس کے مکان سے جعلی موتی بنانے کے بہت سے آلات اور سامان برآمد ہوا اور وہ ڈبہ بھی نکلا جس میں لارنس نے بحیثیت ایک مدراسی جادوگر کے رانی صاحبہ کا اصلی ہار بند کر کے غائب کیا تھا اور جعلی ہار اُس کے بدلے میں واپس کیا تھا۔ یہ جعلی ہار اس خوبی سے بنایا گیا تھا کہ خود رانی صاحبہ نے اس کے اصلی ہونے میں ذرا بھی شبہ نہ کیا حتیٰ کہ پولیس نے یہ ہار لے کر اُن کے سامنے ہی ایک ماہر کو دکھایا جس نے اُس کی قیمت ڈیڑھ دو روپے سے زیادہ نہ آنکھی۔

غرض یہ کہ انہی باتوں پر گفتگو ہو رہی تھی۔ آج ڈاک آنے میں کسی قدر دیر ہو گئی۔ ڈاک آئی اور عباس علی خاں نے اخبار کھولا۔ سب سے

پہلے صفحہ پر نہایت جلی قلم سے لکھا ہوا تھا :۔

"کنور سین کا جیل سے حیرت انگیز فرار"

کنور سین ایک مشہور مجرم جس کے حیرت انگیز کارنامے اور خوفناک جرائم اِس سے قبل اخبار میں شائع ہو چکے ہیں اور جو کپتان عباس علی خاں کی کوشش سے تقریباً ایک ہفتہ ہوا گرفتار ہو گیا تھا کل شب کو مع اپنی بیٹی بملا کے نہایت حیرت انگیز طریقہ پر جیل سے فرار ہو گیا تحقیقات کی جا رہی ہے۔

عباس علی خاں نے زور سے پڑھ کر یہ خبر سب کو سنائی سب نے بے حد حیرت کا اظہار کیا اور دیر تک اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی آخر سب لوگ رخصت ہوئے اور سیٹھ قاسم بھی کسی دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ عباس علی اور سلطانہ برآمدے میں تنہا رہ گئے۔ یہ صبح نہایت خوشگوار تھی ٹھنڈی ہَوا چل رہی تھی سلطانہ سب لوگوں کی موجودگی میں عباس علی سے کچھ فاصلہ پر نیچی نظریں کئے بیٹھی تھی۔ جب سب لوگ چلے گئے اور سیٹھ صاحب بھی اُٹھ گئے تو سلطانہ نے ڈرتے ڈرتے نظر اٹھا کر عباس علی کی طرف دیکھا۔ عباس علی پہلے ہی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں دوچار ہوتے ہی عباس علی

اپنی جگہ سے اٹھا اور سلطانہ سے قریب والی کرسی پر آ بیٹھا
اور آہستہ سے مگر پُر اشتیاق آواز سے ساتھ کہا
"سلطانہ تم نے میری زندگی میں ایک
خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا"

٭ ٭ ٭ ٭

کانِ فریب

(١)

مسٹر جیفرسن دلّی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے کہ چپراسی نے مسٹر کاشانی کا کارڈ پیش کیا۔ صاحب نے کارڈ دیکھ کر فوراً مسٹر کاشانی کو اندر بلا لیا۔

جیفرسن۔ "مسٹر کاشانی میں اِس وقت بہت مصروف ہوں اس لئے جو کچھ کہنا ہے جلد کہہ دیجئے"۔

کاشانی۔ "بہت اچھا، بندہ رخصت چاہتا ہے، میں تو صرف سلام کے لئے حاضر ہوا تھا اور ایک شکایت بھی کرنی تھی"۔

جیفرسن۔ "شکایت! کس کی شکایت ہے؟"

کاشانی۔ "مجھے خفیہ کی انسپکٹری ملے ایک مہینہ ہو چکا، خالی بیٹھا ہوں کوئی دلچسپ کام اب تک میرے سپرد نہیں کیا گیا"

جیفرسن۔ ”کاشانی! آپ ابھی نئے آدمی ہیں کوئی ذمہ داری کا کام آپ کے سپرد نہیں کیا جاسکتا ابھی کچھ دنوں تجربہ حاصل کیجئے۔“

کاشانی۔ ”گستاخی معاف، آپ ہی تجربہ فرمائیں۔“

جیفرسن۔ (کچھ سوچ کر) ”بے شک آپ ذہین اور مستعد آدمی ہیں اور میں آج صبح سے اس پر غور کر رہا تھا کہ ایک خاص کام آپ کے سپرد کرکے آپ کی مستعدی اور کارگذاری کا تجربہ کیا جائے۔ خوب اچھی طرح غور کرکے مجھے بتائیے۔ اگر آپ کے بس کا کام نہ ہو تو ہرگز ہاتھ نہ ڈالئے، کیونکہ اس معاملہ کے انجام پر آپ کے لئے ان دو نتائج میں سے ایک مرتب ہوگا یا ترقی یا برطرفی۔“

کاشانی۔ ”فرمائیے، مجھے کچھ دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔“

جیفرسن۔ ”نواب مسعود حسن خاں کا نام آپ نے سنا ہے؟“

کاشانی۔ ”جی ہاں، سر محبوب حسن خان کے بیٹے جنہوں نے سوتی اور سن کے کام میں لاکھوں روپیہ کمایا اور اب یہ مسعود حسن خاں اس بے شمار دولت کے واحد مالک ہیں، مگر مجھے تو یہ شخص کچھ فاطر العقل سا معلوم ہوتا ہے۔“

جیفرسن۔ ”ہاں میری مراد انہی مسعود حسن خاں سے ہے خان بہادر مسعود حسن خاں .... ایک شخص ہے رابرٹ کلیفرڈ جو ....“

کاشانی۔ ”جو تقریباً ایک مہینہ سے الیسیم ہوٹل میں مقیم ہے“

اور جو اپنے کو آسٹریلیا کا باشندہ بتاتا ہے مگر جو حقیقت میں ایک مشہور بین الاقوامی ڈاکو کنور سین نامی ہے۔"

جیفرسن۔ "تمھیں کس طرح معلوم ہوا؟"

کاشانی۔ "وہ شخص جاسوسی کیا کرے گا، جس کو اپنے شہر میں ایسے مشہور و معروف ڈاکو کے آنے کی بھی خبر نہ ہو۔ جب سے وہ شہر میں آیا ہے میں برابر اُس کی نقل و حرکت سے باخبر رہا ہوں۔ چند روز سے وہ مسعود حسن پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ بہت نرم شکار پھانسا ہے۔"

جیفرسن۔ "مجھے خوشی ہے کہ آپ کی معلومات مکمل ہیں۔"

کاشانی۔ "مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے ایسے نامی ڈاکو کا حریف بننے کے مقابل سمجھا، مگر میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک وہ جرم کا ارتکاب نہ کرے اس وقت تک پولیس کو مداخلت کا کیا حق حاصل ہے اور مسعود حسن خاں سے اس قدر ہمدردی آپ کو کیوں ہے؟"

جیفرسن (کچھ شرمندہ ہو کر) "نہیں ذاتی طور پر تو مجھے کچھ ہمدردی نہیں لیکن سر محبوب حسن خاں ہمارے چیف کمشنر صاحب کے بڑے گہرے دوست تھے اور مرتے ہوئے وہ مسعود حسن خاں کو چیف کمشنر صاحب اور اُن کی بیگم لیڈی سمتھ کے سپرد کر گئے تھے۔ لیڈی سمتھ کو کسی طرح یہ خطرہ پیدا ہوا ہے کہ کلیفرڈ سے جو نئے تعلقات مسعود حسن خاں نے قائم کئے ہیں اور جن کو وہ پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح مسعود حسن خاں کے لئے ضرر رساں ثابت ہوں گے۔ کل ڈنر کے بعد علیحدگی میں لیڈی سمتھ

مجھ سے اس خطرہ کا اظہار کر کے درخواست کی کہ پولیس خفیہ طور پر مسعود حسن خاں
کی حفاظت کا بھی بندوبست کرے اور یہ بھی پتہ لگائے کہ اس دوستی کے
پیچھے کیا راز پوشیدہ ہے؟"

کاشانی:۔ "میرا خیال ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر میں اس کام کو
ختم کر لوں گا۔"

جیفرسن۔ "ہاں اس قدر جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے آدمی
کے مقابلہ میں بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔ پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیئے
کہ اب کیا کرو گے؟"

کاشانی۔ "ایک تسبیح خرید کر اللہ اللہ کروں گا۔"

جیفرسن۔ (چین بجبیں ہو کر) "یعنی؟"

کاشانی:۔ "پادری کا بھیس بھر کر اور ایک تسبیح ہاتھ میں لے کر
نکلسن پارک میں شام کے وقت کلیفرڈ کے سامنے سے گذروں گا۔"

جیفرسن:۔ "یہ تو کچھ بہت بھدا طریقہ ہے۔ خیر تم ذمہ دار ہو
اچھا رخصت۔"

(۲)

شام کے وقت نکلسن پارک میں مسٹر رابرٹ کلیفرڈ آسٹریلیا کے
کروڑ پتی تاجر ٹہل رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ پھولوں سے اُن کو
دلی لگاؤ ہے، کیونکہ ہر پتی اور ہر پھول کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔

چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ نمایاں ہے جس سے ایک ہمدرد دل کا پتہ چلتا ہے۔ کبھی کبھی گردن اٹھا کر اُن بچوں کی طرف بھی دیکھ لیتے ہیں جو کچھ فاصلہ پر ایک سبزے کے قطعہ میں کھیل رہے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ایک نظر میں گردو پیش کا بھی جائزہ لے لیتے ہیں۔ پیچھے سے ایک یورپین رومن کیتھولک پادری صاحب نمودار ہوئے۔ نورانی صورت، سیاہ داڑھی، لمبا سیاہ جُبہ زیرلب کچھ پڑھتے جاتے تھے۔ مسٹر کلیفرڈ کے پاس سے گذرے مگر سر جھکائے ہوئے تھے اس لئے اُن کی طرف توجہ نہ کی۔ کچھ آگے بڑھے جیب میں سے رومال نکالا اُس کے ساتھ ساتھ تسبیح نکل کر زمین پر گر پڑی خود آگے بڑھ گئے۔ مسٹر کلیفرڈ بھانپ گئے۔ تھوڑی دیر تک غور سے پادری صاحب کو دیکھتے رہے۔ پھر کچھ سوچ کر پکارا۔ جناب پادری صاحب! پادری صاحب نے مڑ کر دیکھا اور ادھر متوجہ ہوئے۔ کلیفرڈ نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا، چہرے کو غور سے دیکھا اور کہنے لگے۔ "یار بھیس تو خوب بھرا ہے، کہئے کیا ارادے ہیں؟" پادری صاحب نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور پھر انگریزی میں بولے "مجھے سکاٹ لینڈ سے ہندوستان آئے ہوئے ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں۔ آپ بھی مسافر ہی معلوم ہوتے ہیں؟"

کلیفرڈ۔ "جی ہاں اسی لئے غریب الوطن مسافروں پر ہاتھ صاف کرنا چاہتے ہیں؟"

پادری صاحب۔ "دنیا میں ہر شخص مسافر ہے۔ سفر آخرت کے لئے اُسے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔"

کلیفرڈ۔ اچھا آئیے کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کریں"۔
عام گذرگاہ سے ہٹ کر دونوں ایک بینچ پر بیٹھ گئے

کلیفرڈ۔ "دیکھئے پادریت کو تو بالائے طاق رکھئے۔ میں اِن دم جھانسوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ سچ سچ بتاؤ، آج کل کیا کاروبار کرتے ہو؟"

پادری صاحب۔ "اگر آپ سچ پوچھنا ہی چاہتے ہیں تو سُنئیے! تین برس کی قید کاٹنے کے بعد آج صبح ہی جیل سے رہا ہوا ہوں اور آپ کی شہرت سُن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں"۔

کلیفرڈ۔ "پھر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

پادری صاحب۔ "آپ عموماً بڑے بڑے کاروبار کیا کرتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ مجھے بھی کوئی خدمت سپرد ہو"۔

کلیفرڈ۔ "ہاں مگر میرا تمام کاروبار آسٹریلیا میں ہے۔ یہاں تو میں صرف سیر و سیاحت کے لئے آیا ہوں"۔

پادری صاحب۔ "آسٹریلیا کے قصہ کو تو چھوڑئیے۔ یہاں آپ کا وُرود بے وجہ نہیں ہے۔ میں آپ کے پاس اس حیثیت سے نہیں آیا کہ آپ مسٹر کلیفرڈ ہیں بلکہ میں آپ کو مسٹر کنورسین کی حیثیت سے خطاب کر رہا ہوں جن کے شاندار کارنامے ہمارے پیشے کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں"۔

کلیفرڈ (اپنی تعریف سے خوش ہو کر) "خوب کیوں نہ ہو" ولی را ولی می شناسد"۔ مگر صاحبزادے یہ تو بتاؤ مجھے تم اس حیثیت سے کب سے

اور کس طرح جانتے ہو؟"

پادری صاحب۔ "میرا اصلی نام ہیرا ہے۔ شاید آپ نے کبھی سنا ہو ایک زمانے میں جب آپ اور لارنس یہیں دہلی میں کام کر رہے تھے تو انھوں نے مجھے بھی بلایا تھا۔ مگر اسی اثنار میں مجھے اطلاع ملی کہ عباس علی خاں کی وجہ سے معاملہ بگڑ گیا۔"

کلیفرڈ۔ "خیر یہ بتاؤ تمھارا مکان کہاں ہے؟"

پادری صاحب "مستقل مکان تو جیل خانہ ہے، عارضی طور پر جہاں جگہ مل جائے۔"

کلیفرڈ۔ تمھارا یہ بھیس ہمیں بہت پسند آیا۔ اب مستقل طور پر تم اسی بھیس میں رہو (بیس روپے کے دو نوٹ دیتے ہوئے) یہ لو جب تک دوسرا کوئی بندوبست ہو اس وقت تک کے لئے یہ تمھارا خرچ ہے۔ ہم نے تمھارا نام میکفرسن رکھ دیا ہے۔ اب تم میرے ساتھ ہوٹل چلو۔ کھانا کھا کر جانا۔ کل صبح ہوٹل ہی میں مجھ سے ملنا۔"

دونوں الیسیم ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے اور راستے میں جرح کے جس قدر سوال ہو سکتے تھے مسٹر کلیفرڈ الموسوم کنور سین نے پادری میکفرسن المعروف سُراغ رساں کاشانی سے دریافت کئے اور اس امر میں شبہ کی ذرا بھی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ ایک کہنہ مشق بدمعاش ہے جو اپنے پیشے کے تمام داؤ پیچ سے واقف ہونے کے علاوہ بلا کا ذہین ہے اور کنور سین ہمیشہ سے ایسے جوہر کا سچا قدردان رہا ہے۔ اِس لئے اُس نے فیصلہ کیا کہ

اِس شخص کو آلہ کار بنانا چاہیئے۔

(۳۶)

کاشانی یا پادری میکفرسن جب سپرنٹنڈنٹ جیفرسن کے سامنے پیش کیا گیا تو سپرنٹنڈنٹ نے دل میں تو شاید کاشانی کے بہروپ کی تعریف کی ہو، مگر زبان سے اظہارِ ناراضگی کیا۔ کاشانی نے نہایت خاموشی سے جیب سے بیس روپے کے دو نوٹ نکالے اور سپرنٹنڈنٹ کے سامنے رکھ دیئے۔

جیفرسن۔ "یہ کیا ہے؟"

کاشانی۔ "پولیس کے خیرات خانے کے لئے آسٹریلیا کے کروڑپتی مسٹر کلیفرڈ کا عطیہ۔"

جیفرسن۔ "کیسے؟"

کاشانی نے مختصراً اپنی کارگذاری سنائی۔ سپرنٹنڈنٹ نے صرف یہ کہا۔ "خیر ابتدا تو بُری نہیں۔" اس کے بعد کاشانی یہاں سے رخصت ہوا اور سیدھا الیسیم ہوٹل پہنچا۔ کلیفرڈ نے فوراً اندر بلا لیا اور چائے پلانے کے بعد بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی اور کلیفرڈ کے نزدیک جتنی آزمائشیں ضروری تھیں سب ہو چکیں تو پھر اُس نے یوں سلسلۂ کلام شروع کیا۔

کلیفرڈ۔ "پادری میکفرسن! کبھی تم نے جغرافیہ بھی پڑھا ہے؟"

میکفرسن۔ "پڑھا تو تھا، کہیئے۔"

کلیفرڈ۔ "آسٹریلیا کے مغربی حصہ میں سونے کی کانیں پائی جاتی ہیں۔"
میکفرسن۔ "کال گرلی اور کول گارڈی سونے کی کانوں کے لئے مشہور ہے۔"
کلیفرڈ۔ "شاباش! آپ تو جغرافیہ میں طاق معلوم ہوتے ہیں یہ تو بہت خشک جگہ ہے۔ اس سے شمال مغرب کی طرف تقریبًا ایک ہزار میل دور ایک چھوٹا سا دریا گیس کوئن نامی بہتا ہے۔ ابتدائی حصہ میں اُس کی گزرگاہ بالکل غیر آباد ہے۔ مگر سیر و شکار کی بہت عمدہ جگہ ہے۔ سال بھر کا عرصہ ہوا میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ اس علاقے میں سیر کرتا پھرتا تھا ایک روز دریا کے کنارے بیٹھا ہاتھ مُنہ دھو رہا تھا دیکھا کہ اُس گھاس کی جڑیں جو کنارے پر اُگ رہی تھی کوئی چیز چمک رہی ہے۔ گھاس اُکھاڑی تو ہاتھ پر بہت سے سُنہرے ذرّات جھڑے۔ بڑی حیرت ہوئی اور کئی جگہ سے گھاس اُکھاڑی ہر جگہ یہی کرشمہ نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ اس جگہ کی تمام زمین میں سُنہرے ذرّات ہیں۔"

میکفرسن۔ "تانبے کے ذرّے ہوں گے۔"

کلیفرڈ۔ "واہ جی یہ کیا کہا؟ خالص سونے کے۔"

میکفرسن۔ "یہ کیسے معلوم ہوا؟"

کلیفرڈ۔ "میں نے کئی جگہ کی گھاس اُکھاڑ کر مع مٹی کے ایک کاغذ میں باندھ لی۔ اور سڈنی پہنچ کر جہاں میرا کاروبار ہے اپنے سُناروں کو دکھایا تو انہوں نے یقین دلایا کہ یہ خالص سونا ہے۔ بس میں نے فورًا حکومت سے اس وادی کا ننانوے سال کے لئے ٹھیکہ لے لیا۔ یہ کئی ہزار ایکڑ زمین ہے

غیر آباد ہونے کی وجہ سے حکومت نے صرف بیس ہزار ڈالر میں ٹھیکہ دے دیا اسی اثنا میں میرے کاروبار میں کچھ ایسی پیچیدگیاں واقع ہوئیں کہ میں گھبرا کر دنیا کی سیاحت کے لئے نکل پڑا اور گھومتا گھامتا ہندوستان آپہنچا۔ اب خیال ہے کہ اس وادی میں کھدائی کا کام فوراً شروع کر دیا جائے اور اس بے شمار دولت سے فائدہ اٹھایا جائے جو صدیوں سے اس زمین میں مدفون ہے۔ دہلی آکر نواب مسعود حسن خاں سے ملاقات ہوئی اور اُن کی خوش اخلاقیوں اور مہربانیوں کا ایسا گرویدہ بنا کہ یہ راز بھی بتا دیا جس کو میرے سوا صرف ایک شخص اور جانتا ہے۔ یعنی وہ دوست جو اس وادی میں میرا ہمسفر تھا اور جس نے ایک دفعہ مجھے دریا میں ڈوبنے سے بھی بچایا تھا۔ اب نواب صاحب کا اصرار ہے کہ اس کام میں اُن کو بھی شریک کر لیا جائے۔ آج اُن سے وعدہ ہے کہ گھاس کے نمونے اُن کو دکھا دیئے جائیں گے جس کی جڑ میں مٹی کے ساتھ سونے کے ذرات چمٹے ہوئے ہیں۔"

میکفرسن۔ "مگر سونے کے ذرے آپ کے پاس کہاں سے آئے؟ تانبے کے ہوں گے؟"

کلیفرڈ۔ "تم بھی عجیب احمق ہو۔ میاں کئی سو روپے خرچ کر کے سونے کے یہ ذرات بنوائے ہیں۔ پھر ریت اور مٹی میں ملا کر گھاس کی جڑوں میں چپکائے ہیں۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ ہر کاروبار میں روپیہ لگانے کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے اور میں کچا کام کرنا پسند نہیں کرتا۔"

میکفرسن۔ "اچھا یہ تو بتائیے کہ میرے سپرد کیا خدمت ہوگی؟"

کلیفرڈ۔"ساری کتھائیں لی اور بدھو میاں کو یہ خبر نہیں کہ زلیخا مرد تھی یا عورت تھا۔ وہ دوست جو میرا شریک سفر تھا جس نے میری جان بچائی تھی جو میرا رازداں ہے اور اس کام میں برابر کا شریک ہے اور نفع میں برابر کا حصہ دار ہے، اُس کا نام پادری میکفرسن ہے۔"

میکفرسن (خوش ہو کر) "اچھا اچھا اب میں سمجھا تو میں نفع میں آدھے کا شریک ہوں۔"

کلیفرڈ۔"بھئی کیا بھولے پن کی باتیں کرتے ہو۔ یہ ساری باتیں تو ایک افسانہ ہیں مسعود حسن کو پھنسانے کے لئے۔"

میکفرسن۔"اور در اصل مجھے کیا ملے گا؟"

کلیفرڈ۔"بس تمھیں خوش کر دوں گا، ساری عمر کے لئے نہال ہو جاؤ گے"

میکفرسن۔"اچھا خیر آپ کو اختیار ہے مگر مسعود حسن خاں سے نفع میں کتنی شرکت ٹھیری؟"

کلیفرڈ۔"روپے میں چار آنے۔"

میکفرسن۔"مگر جناب کہیں اتنا تھوڑا نفع سُن کر ہتھے سے نہ اکھڑ جائے"

کلیفرڈ۔"واہ جمانے کا تو یہی طریقہ ہے۔ حقیقت کا یقین تو اسی لئے آیا کہ صرف چار آنے اُسے دیں گے اور چھ چھ آنے خود رکھیں گے۔ کشش تو اس میں ہے کہ چار آنے کے حساب سے بھی کروڑوں بلکہ اربوں روپے کا فائدہ ہے (گھڑی دیکھ کر) اب اُس کے آنے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی ہے۔ میں اُس سے کہوں گا کہ تم آج ہی بمبئی سے آئے ہو اور یہ سُن کر کہ

میں نے مسعود حسن خاں کو بھی شریک بنالیا ہے سخت ناراض ہو۔ اُس کے سامنے بھی تم بہت مشکل سے رضامند ہونا۔ بس یہ چیز اُس کو پوری طرح جما دے گی۔"

نواب مسعود حسن خان جب کمرے میں داخل ہوئے تو کلیفرڈ کے پاس ایک پادری کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر قدرے متعجب ہوئے مگر کلیفرڈ نے پادری میکفرسن کا تعارف اُن سے اسی حیثیت سے کرایا جیسا کہ قرار پاچکا تھا۔ میکفرسن نے ایسی قہر آلود نظر مسعود حسن پر ڈالی کہ بیچارہ پریشان ہوگیا۔ کلیفرڈ نے جب اُن کو بتایا کہ میکفرسن اُن کی شراکت پر تیار نہیں ہوتا تو وہ بہت آزردہ ہوئے اور کہنے لگے:۔

مسعود حسن "میں یہ پوچھتا ہوں کہ میرے شریک ہوجانے میں آپ کا ہرج کیا ہے۔ آخر میں بھی تو سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہوں۔"

میکفرسن "آپ کا سرمایہ آپ کو مبارک۔ یہ تو آپ اُس سے کہیں جس کے پاس خود اپنا سرمایہ نہ ہو۔ کلیفرڈ تو بہت بھولے آدمی ہیں۔ بھلا ایسے کاموں میں کوئی دوسرے کو شریک کیا کرتا ہے، آپ سے ہمارا کیا واسطہ اور کیا تعلق۔ آپ ہندوستانی ہم آسٹریلیا کے رہنے والے۔"

کلیفرڈ "نہیں بھائی میکفرسن یہ نہ کہو مجھے تمھارے اِس فقرے سے سخت تکلیف ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے جس طرح تمھارا احسان میرے سر پر ہے۔ اسی طرح نواب صاحب کے احسانات و مہربانیاں بھی

میں تمام عمر نہیں بھول سکتا اور نسلی امتیاز کو بھی میں بڑی تنگ نظری سمجھتا ہوں
میں کیا بتاؤں میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ تم اس چیز کی مخالفت
کروگے۔ اب میں زبان دبے بیٹھا ہوں۔ دونوں طرف سے شرمندگی ہے۔"

میکفرسن۔ "کلیفرڈ! یہ تم سے بہت بڑی حماقت ہوئی ہفتے دو
ہفتے کی کیا بات تھی۔ کم از کم میرے آنے تک تو انتظار کرتے۔ نہیں یہ
ہرگز نہیں ہوسکتا۔"

مسعود حسن۔ "دیکھئے صاحب میں تو اپنے وعدے پر قائم ہوں
اور جس وقت کہیں فوراً روپیہ پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اتنے بڑے
کام کے لئے تو جتنا سرمایہ ہو تھوڑا ہے۔ مجھے آپ شریک کرلیں تو آپ کا
کچھ ہرج نہیں۔ اس قدر بے شمار دولت میں سے اگر مجھے بھی کچھ حصّہ
مل گیا تو آپ کا کیا نقصان ہے؟"

میکفرسن۔ "واہ نقصان کیوں نہیں، جیسے آپ ہی بڑے عقلمند ہیں۔
اگر ہمیں بے شمار دولت مل رہی ہے تو خواہ مخواہ بانٹتے کیوں پھریں۔ یہ بھی
خوب رہی۔"

کلیفرڈ۔ "آپ دونوں کی بحث سے مجھے سخت تکلیف پہنچ رہی ہے
بھائی میکفرسن میری خاطر سے آپ مان لیں اور مجھے نواب صاحب سے
شرمندہ نہ کرائیں۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا ہوچکا۔ اب چاہے آپ اسے
میری حماقت سمجھئے یا عقلمندی۔ اچھا آئیے نواب صاحب آپ کو
نمونے تو دکھادوں۔ آؤ بھائی میکفرسن تم بھی ساتھ آؤ۔"

میکفرسن۔ "مجھے تو ضرورت نہیں میں نہیں جاتا۔"

کلیفرڈ۔ "مسعود حسن خاں کو لے کر اپنی خواب گاہ میں گیا اور اپنے پلنگ کے نیچے سے ایک بھاری ٹرنک کھینچا۔ ڈھکنا کھولنے پر معلوم ہوا کہ گھاس اور مٹی کا انبار لگا ہوا ہے۔ ایک کاغذ نواب صاحب کے ہاتھ پر رکھ کر اُس پر کلیفرڈ نے تین چار جڑیں گھاس کی مٹی سمیت اُکھاڑ کر رکھ دیں پھر بکس بند کر کے پلنگ کے نیچے سرکا دیا اور نشست کے کمرے میں لاکر مسعود حسن خاں کو دکھایا کہ اس مٹی میں بے شمار سنہرے ذرات چمٹے ہوئے تھے۔ جب مسعود حسن خاں بغور اُس کو دیکھ چکے تو کلیفرڈ نے اُس مٹی پر کاغذ لپیٹ کر ایک چھوٹا سا پیکٹ بنایا اور مسعود حسن خاں کے حوالے کیا۔"

کلیفرڈ۔ "بھائی میکفرسن کو میں کسی نہ کسی طرح راضی کر لوں گا۔ اب تو صاف صاف معاملہ یہ ہے کہ کل دس بجے تک اگر آپ ساٹھ ہزار روپے کا بندوبست کر دیں تو یہ معاملہ پختہ ہو جائے گا، ورنہ پھر اس معاملہ کے متعلق کوئی گفتگو نہ کی جائے گی۔"

مسعود حسن۔ "صاحب یہ میعاد تو بہت تھوڑی ہے۔ اتنی بڑی رقم کا ایک دن میں مہیا کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔"

کلیفرڈ۔ "اگر یہ بات ہے تو اسی وقت اِس معاملہ کو ختم سمجھئے۔ میں بھی عنقریب یہاں سے روانگی کا انتظام کر رہا ہوں۔"

مسعود حسن۔ "خیر میں کسی نہ کسی طرح رقم تو مہیا کر لوں گا مگر شرط یہ ہے کہ میں اِس نمونے کو اپنے سُناروں کو دکھا کر اپنا اطمینان کر لوں۔"

کلیفرڈ۔ (ذرا تیز آواز سے) "ضرور ضرور۔ اگر سونے میں ذرا بھی نقص ہو تو بھی یہ معاملہ ختم سمجھئے اور پھر ایسے آدمی سے دوستی رکھنا بھی مناسب نہیں جو آپ کو اس طرح دھوکا دینا چاہے۔"

مسعود حسن۔ "نہیں نہیں میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ آپ بُرا نہ مانیں میں نے تو ویسے ہی کہہ دیا تھا۔"

کلیفرڈ۔ "نہیں جناب بُرا ماننے کی بات نہیں۔ میں آپ کے روپے کو ہرگز ہاتھ نہ لگاؤں گا جب تک آپ مجھے یقین نہ دلا دیں کہ آپ نے سنار کو یہ نمونے دکھا کر اپنا اطمینان کر لیا ہے۔"

مسعود حسن۔ "خیر آپ اتنا اصرار کرتے ہیں تو میں دکھالاؤں گا ورنہ ضرورت تو ہے نہیں۔ ذرا یہ بھی مجھے بتا دیجئے کہ اس روپے کو کیا کریں گے؟"

کلیفرڈ۔ "ہاں یہ بھی معاملہ کی بات ہے۔ سُنئے! جب آپ روپیہ لے آئیں گے تو ہم تینوں مل کر چارٹرڈ بینک چلیں گے اور وہاں یہ رقم تینوں کے مشترکہ حساب میں جمع کرا دیں گے۔ اس رقم میں سے روپیہ اس وقت تک برآمد نہ ہو سکے گا جب تک چک پر تینوں کے دستخط نہ ہوں اور پھر بہت جلد اپنا کام شروع کریں گے۔ شاید اس سلسلہ میں آپ کو بھی آسٹریلیا جانا پڑے۔"

مسعود حسن۔ "یہ تجویز بالکل مناسب ہے۔ اچھا میں اب رخصت چاہتا ہوں۔ کل ساڑھے دس بجے رقم لے کر یہیں حاضر ہو جاؤں گا۔"

کلیفرڈ۔ "مگر پہلے سونے کے متعلق اطمینان کر لیجئے گا۔"

مسعود حسن (مسکراتے ہوئے) تعمیلِ ارشاد سے مجبور ہوں۔"

مسعود حسن خاں نے رخصت ہوتے ہوئے دیکھا کہ میکفرسن اُن کو بہت قہر آلود نظروں سے گھور رہا ہے ✤

مسعود حسن خاں کے چلے جانے کے بعد کلیفرڈ نے میکفرسن کو بہت شاباش دی اور کہنے لگا "یہاں تک تو معاملہ ٹھیک ہو گیا مگر اب سوچنا یہ ہے کہ جب یہ شخص ساٹھ ہزار روپے لے آئے تو خود اس سے کیونکر چھٹکارا حاصل کیا جائے؟"

میکفرسن "واہ یہ کون سی مشکل بات ہے۔ تم کہتے تھے کہ تمھارا ہوائی جہاز کل سوا دس بجے پرواز کے لئے بالکل تیار ہو گا۔ لہٰذا اسی کمرے میں پہلے تو اُسے عدم آباد کا ٹکٹ دلوا دیا جائے اور گٹھڑی باندھ کر تمھارے پلنگ کے نیچے چھپا دیا جائے پھر دروازہ بند کر کے سیدھے ہوائی سٹیشن موٹر سے پہنچیں گے اور ہوائی جہاز سے روانہ ہو جائیں گے۔ اگر گھنٹے دو گھنٹے کا وقفہ بھی مل گیا تو بہت کافی ہے پھر تو کوئی یاروں کی گرد بھی نہ پائے گا۔"

کلیفرڈ۔ "نہیں بھئی یہ ترکیب تو بہت بھدی ہے ہمیں پسند نہیں آئی۔"

میکفرسن۔ (کچھ سوچ کر) "ایک بڑی عمدہ ترکیب خیال میں آئی، سنئے اور داد دیجئے۔ کل صبح میں ایک سب انسپکٹر کا بھیس بھر کر آجاؤں گا اور تمھارے کمرے میں چھپ رہوں گا جب وہ روپیہ لے کر

آئے گا اور تم روپیہ گن کر اپنی جیب میں رکھ لو گے تو میں فوراً باہر نکل کر تمھیں گرفتار کر لوں گا اور نواب کو اطمینان دلا دوں گا کہ دھوکہ دیہے کے جرم میں میں نے تمھیں گرفتار کیا ہے اور جب تک مجسٹریٹ کے سامنے بیان نہ ہو جائے یہ رقم ملزم کی جیب ہی میں رہنی چاہیے اطمینان دلا کر اُسے گھر بھیج دیں گے اور ہم دونوں موٹر میں بیٹھ ہوائی سٹیشن پر پہنچ جائیں گے کہو کیسی کہی؟"

کلیفرڈ۔ "بھئی تجویز تو لاجواب ہے۔ میں تمھاری ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ اچھا اب جاؤ۔ کل صبح میں خود تمھارا بھیس بدلواؤں گا۔"

کلیفرڈ میکفرسن سے بہت خوش تھا۔ وہ اُسے پہنچانے کے لئے ہوٹل کے دروازے تک آیا۔ جب پائیں باغ میں آئے تو دیکھا کہ سڑک پر ایک کار کھڑی ہے جس کے سامنے مسٹر جیفرسن سپرنٹنڈنٹ پولیس دہلی کھڑے ہیں۔ اُن کو دیکھتے ہی میکفرسن جھجک کر پیچھے ہٹا۔ مگر جیفرسن نے آگے بڑھ کر مسٹر کلیفرڈ سے مصافحہ کیا اور کہا۔ "مسٹر کلیفرڈ! میں اِس وقت آپ ہی کے پاس آیا تھا۔ یہ شخص جو اس وقت آپ کے ساتھ ہے ایک عادی مجرم ہے کئی بار سزایاب ہو چکا ہے اور ابھی حال ہی میں رہا ہوا ہے۔ مجھے ابھی معلوم ہوا کہ دو تین روز سے یہ آپ کے ساتھ ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں آپ کو خبردار کر دوں۔"

میکفرسن۔ "دیکھو جی تم کون ہوتے ہو اس طرح میری بُرائیاں کرنے والے۔ یہ مانا کہ میں نے بُرا کیا اور اُس کا نتیجہ بھگتا۔ مگر اب تو میں

توبہ کر چکا ہوں۔ اس طرح دوسروں کی نظروں میں ذلیل کر کے تمھیں کیا مل جائے گا؟"

کلیفرڈ۔ "مسٹر جیفرسن! آپ کی عنایت کا شکریہ۔ اس شخص نے اپنے تمام گذشتہ جرموں کا اعتراف میرے سامنے کر لیا ہے اور سچے دل سے پشیمان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ روپے پیسے سے اُس کی مدد کر دوں" تاکہ یہ ایک نیک چلن اور پُرامن شہری بن جائے"۔

جیفرسن۔ "خیر میں اپنا فرض ادا کر چکا۔ اب آپ کو اختیار ہے"۔

جیفرسن کے جانے کے بعد میکفرسن نے پولیس والوں کو اتنی گالیاں دیں کہ اُس کی طرف سے کلیفرڈ کے دل میں اگر کچھ شبہ ہوگا تو وہ بھی زائل ہو گیا۔

(۴)

صبح سوا نو بجے مسٹر کلیفرڈ اپنے کمرے میں ایک باوردی سب انسپکٹر پولیس کو داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر چونک پڑے اور قریب تھا کہ اُٹھ کر بھاگ جائیں، مگر ذرا جھجکے۔ سب انسپکٹر کے چہرے پر ایک غائر نظر ڈالی اور مسکرا کر کہنے لگے۔ "بہت خوب، بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جو چیز مجھے دھوکے میں ڈال سکتی ہے یقیناً دنیا میں کوئی شخص اُس کے فریب سے نہیں بچ سکتا۔ مجھے اس فن میں کمال رکھنے پر ناز رہا ہے اور اسی لئے کل میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ کام میرے سامنے ہونا چاہئے، مگر جس خوبی سے تم نے اسے سرانجام دیا ہے اس میں اضافے یا ترمیم کی گنجائش

نہیں۔ خیر کچھ بھی سہی مگر اس وردی کو دیکھ کر خواہ مخواہ میرے دل میں ایک بےچینی سی پیدا ہوتی ہے۔ تمھاری بتائی ہوئی ترکیب بڑی بے نظیر ہے اِس سے بہتر کوئی اور ترکیب سمجھ میں نہیں آتی۔ ورنہ یہ وردی اور یہ گرفتاری کا قصہ کچھ پریشان کرنے والی چیزیں ہیں۔"

میکفرسن۔ "پریشانی کی کیا بات ہے۔ ساٹھ ہزار روپے پر قبضہ جمانا بھی تو کچھ ہنسی کھیل نہیں۔ اچھا یہ تو بتائیے مسعود حسن یہ نہ پوچھے گا کہ میکفرسن کہاں ہے۔"

کلیفرڈ (ایک تار کا لفافہ میکفرسن کو دیتے ہوئے) "کلیفرڈ کوئی کام ادھورا نہیں کیا کرتا۔"

پادری میکفرسن یا سُراغ رساں کاشانی نے لفافہ کھولا۔ پادری میکفرسن کی طرف سے کلیفرڈ کے نام ایک تار تھا جو نئی دہلی سے آج صبح ہی دیا گیا تھا۔ لکھا تھا کہ "ایک ضرورت سے میں وقت پر ہوٹل نہ پہنچ سکوں گا۔ اِس لئے بینک ہی میں ملوں گا۔"

میکفرسن۔ "یہ تو خوب سوجھی۔ بس اب تو پورا یقین آجائے گا۔ اچھا اب وقت ہو چکا۔ میں تمھارے غسل خانے میں چھپا جاتا ہوں اور پردے کے پیچھے سے دیکھتا رہوں گا۔ جب نوٹ گن کر تم جیب میں رکھ لوگے اُس وقت میں باہر نکلوں گا۔"

کلیفرڈ۔ "بالکل ٹھیک ہے۔"

میکفرسن۔ "ہوائی جہاز کے متعلق کہلا بھیجا تھا؟"

کلیفرڈ۔ "جی ہاں وہاں معاملہ بالکل تیار ہوگا"۔
میکفرسن۔ "موٹر میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ ہے تو ٹیکسی۔ مگر اُس کا ڈرائیور ہمارا پُرانا یار ہے"۔
کلیفرڈ۔ "اچھا! اچھا!! اب تم جلدی سے غسل خانہ میں چلے جاؤ"۔
چند منٹ کے بعد مسعود حسن خاں بہت خوش خوش کمرے میں داخل ہوئے۔ کلیفرڈ نے پوچھا، کہئے صاحب! نمونے آپ نے سُنار کو دکھالئے؟"
مسعود حسن۔ "جی ہاں دکھالئے۔ سُنار میرے بہت سر ہوا پوچھتا تھا کہ "یہ مٹی کہاں کی ہے اور اِس میں سونا کیوں ملا ہوا ہے؟"
کلیفرڈ۔ "آپ نے اُسے کچھ بتایا تو نہیں؟"
مسعود حسن۔ "واہ بھلا یہ ممکن تھا (جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا لفافہ نکالتے ہوئے) یہ رقم میں لے آیا ہوں۔ آپ اِسے گِن کر دیکھ لیں"۔
کلیفرڈ۔ "گننے کی کیا ضرورت ہے، ٹھیک ہوگی"۔
مسعود حسن۔ نہیں جناب! جس طرح مجھے آپ نے کل اِس بات پر مجبور کیا تھا کہ میں سُنار کو نمونہ دکھالوں اُسی طرح میں بھی اِصرار کرتا ہوں کہ آپ رقم سنبھال لیں"۔
کلیفرڈ۔ "آپ فرماتے ہیں تو خیر گنے لیتا ہوں"۔
مسعود حسن۔ "میکفرسن صاحب نظر نہیں آتے"۔
کلیفرڈ۔ "جی ہاں لیجئے دیکھئے یہ تار آیا ہے۔ میکفرسن بھی بڑا عجیب آدمی ہے۔ ضِدی بہت ہے آپ کے جانے کے بعد میں نے بڑی مشکل

سے راضی کیا۔"

مسعود حسن -" آپ کا شکریہ۔ میں تو کچھ مایوس ہی ہو چلا تھا بہت اڑیل آدمی ہے۔"

کلیفرڈ -" جی ہاں، مگر اُس کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں (نوٹ گننے کے بعد لفافے میں رکھتے ہوئے) اچھا تو یہ رقم آپ رکھیں گے یا میں ہی رکھ لوں؟"

مسعود حسن -" ہاں ہاں آپ ہی رکھ لیجئے۔"

کلیفرڈ نے رقم جیب میں رکھی ہی تھی کہ سُراغ رساں کاشانی بڑی شان سے اپنی کمیں گاہ سے نکلا اور کھٹ سے ہتھکڑی کلیفرڈ یا کنور سین کے ہاتھ میں ڈال دی۔ جس نے گھبرا کر کہا۔" اس کی کیا ضرورت تھی اور پھر غصہ سے برافروختہ ہو کر بولا، اِس بے جا مداخلت کے کیا معنی؟ تمھیں معلوم نہیں کہ میں ایک غیر ملکی معزز تاجر ہوں۔"

کاشانی -" جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ آپ مشہور بین الاقوامی مجرم کنور سین ہیں جو ایک معزز بھولے بھالے شہری کو اپنے جال میں پھنسا کر اُس سے ساٹھ ہزار روپے کی گراں قدر رقم ٹھگ رہے ہیں۔"

مسعود حسن خاں حیران و ششدر تھے۔ مُنہ کھلا ہوا آنکھیں پھٹی ہوئی کبھی کاشانی کو اور کبھی کلیفرڈ کو دیکھتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔ کاشانی نے کلیفرڈ کو آگے بڑھایا۔ بمشکل مسعود حسن خاں کے مُنہ سے نکلا۔" اور میری رقم؟"

کاشانی:- "نواب صاحب! آپ بالکل مطمئن رہیں۔ آپ کی رقم محفوظ ہے، مگر چونکہ ملزم کے جرم کا یہ رقم ہی ثبوت ہے، اِس لئے مقدمے کے فیصلہ تک یہ رقم سرکاری خزانے میں رکھی جائے گی۔ اَب آپ گھر جائیے۔"

کلیفرڈ:- "کاشانی کے کان میں مگر کچھ سامان اور بھی تو لے لوں۔"

کاشانی:- "سامان آتا رہے گا، آپ تو چلیئے۔"

دونوں باہر نکلے ہوٹل کے دروازے پر دہلی پولیس کی کار کھڑی تھی، کلیفرڈ کے مُنہ سے نکلا "دغا دھوکہ"۔ کاشانی نے اُس کو کار میں ٹھونس دیا، جہاں پہلے سے ایک باوردی سپاہی بیٹھا تھا ؛

(۵)

سُپرنٹنڈنٹ جیفرسن:- "کاشانی تمھیں معلوم نہیں کہ خفیہ پولیس کے آدمیوں کے لئے عام پولیس کی وردی پہننا سخت جرم ہے یہ وردی تمھارے پاس کہاں سے آئی؟"

کاشانی:- "یہ وردی تو میں نے اپنے ایک دوست سے عاریتاً مانگ لی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ اِس وردی کا پہننا میرے لئے جُرم ہے اور جس نے مجھے وردی عاریتاً دی تھی اُس کا جُرم مجھ سے بھی زیادہ سنگین ہے، مگر ضرورت سب کچھ کرا دیتی ہے۔"

جیفرسن:- "کلیفرڈ کہاں ہے؟"

کاشانی۔ "جیل میں، اور ساٹھ ہزار روپے کے نوٹ جو مسعود حسن خاں کی ملکیت ہیں اور جو اُس کی جیب سے برآمد ہوئے ہیں سرکاری خزانہ میں داخل ہو چکے ہیں۔"

جیفرسن۔ "خیر یہ کام تم نے خاصہ کیا۔ ترقی کے لئے ہم تمھاری سفارش کریں گے۔ ہمارے پُرانے دوست اور تمھارے اُستاد کپتان عباس علی خاں نے بھی تمھاری سفارش کی ہے۔"

کاشانی۔ "جناب کی عنایت کا شکریہ، اگر کنور سین کو جیل میں بھی یہ معلوم ہوا کہ اس دفعہ کپتان عباس علی خاں کے ایک شاگرد سے مات کھائی ہے تو شاید غیرت سے زہر کھا کر سو جائے گا +

افسانہ نگار

کراچی میل جب لاہور سے روانہ ہوا تو ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ
میں صرف ایک مسافر بیٹھا ہوا تھا۔ ریل چلتے ہی اُس نے ایک سیٹ پر اپنا
بستر کھولا۔ دوسری سیٹ پر اپنا کمبل رکھا۔ پھر سوٹ کیس کھول کر کچھ
کتابیں اور اخبار نکالے اور تیسری اور چوتھی سیٹ پر انہیں کچھ اس
انداز سے پھیلا دیا کہ آئندہ کسی سٹیشن پر کوئی مسافر آئے تو یہ دیکھ کر
کہ جگہ خالی نہیں واپس چلا جائے۔ آپ کہیں گے کہ یہ بڑی خود غرضی تھی
مگر ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ خود غرضی تو ریل کے ہر مسافر کی
خاصیت ہے۔ اس کے لئے تنہا ہمارا ہی مسافر موردِ الزام قرار نہیں دیا
جا سکتا۔ خیر آئیے اب ذرا اِن حضرت کا ظاہری اور باطنی جائزہ تو لیں۔
دراز قامت، گندمی رنگ، داڑھی مونچھ صاف اور نہ صرف داڑھی مونچھ
صاف بلکہ چندیا کے بال بھی ہر قسم کی روئیدگی سے پاک۔ جسم زیادہ کھانے

اور بے فکری و آسائش کی وجہ سے پھولا ہوا، بے فکری و آسائش کے
آثار چہرے سے بھی ظاہر۔ کپڑوں سے بھی نفاست، صفائی، امارت اور
مغرب پسندی ظاہر ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اخبار کھول کر پڑھنا
شروع کیا۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ خبروں، ایڈیٹر کے نام چٹھیوں،
ایڈیٹوریل، اشتہارات سب کچھ چھوڑ کر آپ نے ایک کتاب کا ریویو پڑھنا
شروع کیا اور بہت انہماک اور غیر معمولی دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا۔ جب
یہ لمبا ریویو ختم ہو گیا تو مسافر نے اخبار رکھ دیا اور ایک فسانہ پڑھنے لگا
اسی وقت پاخانے کا دروازہ کھلا اور ایک مسافر ایک پرانا سا سوٹ
پہنے کمبل گلے میں لپیٹے برآمد ہوا اور سیٹ کے نیچے سے ایک چھوٹا سا
بستر اٹھایا۔ بستر کیا تھا ایک چھوٹا سا تکیہ کھیس میں لپیٹ ایک چمڑے
کے تسمے میں باندھ رکھا تھا۔ یہ عجیب و غریب مسافر بلا تکلف پہلے والے
مسافر کے بالکل سامنے آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک کھڑکی کے باہر دیکھتا رہا
پھر اپنا تکیہ کھڑا کر کے اُس کے سہارے سے ذرا ٹیک لگا کر لیٹ گیا
پہلا مسافر ابھی تک افسانہ پڑھنے میں بدستور منہمک تھا۔ دفعتہً اُس
نے ایک آواز سنی چونکہ کمرے میں ایک ہی آدمی اور تھا اس لئے یقین
کرنا پڑتا تھا کہ اُسی نے یہ بات کہی ہوگی۔ مگر شبہ ہوتا تھا کہ کہیں خود
اُس کے اپنے دماغ کی کوئی چول زیادہ کام کرنے کی وجہ سے ڈھیلی
نہ ہو گئی ہو۔ تاہم وہ اب اپنے ہم سفر کی طرف سے کسی قدر زیادہ متوجہ
ہو گیا اور افسانے میں بے لطفی پیدا ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں دوسرے مسافر

تے پھر وہی کہا جو پہلے کہہ چکا تھا۔" جہاں تک قتل کی وارداتوں کا تعلق ہے بعض سُراغ رسانی کے افسانے لکھنے والے عجیب حماقتیں کیا کرتے ہیں۔" پہلے مسافر نے پھر چونک کر ذرا غور سے اپنے ہم سفر کو دیکھا اُس نے بغیر مسکرائے یا آنکھ جھپکائے کسی قدر بلند آواز سے کہا "ہاں میں تم سے ہی مخاطب ہوں۔" پہلا مسافر جو غالباً اِس قسم کی گفتگو کا عادی نہ تھا بولا۔" یعنی آپ کا کیا مطلب ہے ؟"

دوسرا مسافر:۔ "میرا وہی مطلب ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ یعنی تم جیسے لوگ جب سُراغ رسانی کے افسانے لکھتے ہیں تو قتل کے واقعات بیان کرنے میں تمھارے خیالات اس قدر بھونڈے اور بھّدے ہوتے ہیں کہ سارا مزا کر کرا ہو جاتا ہے۔ تمھیں ایک معمولی سا قتل دکھانے کے لئے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور اس قدر ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے گویا ایک قلعہ جیتنے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پولیس کو قاتل کا سراغ لگانے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی اور جو قتلیں تم دکھاتے ہو وہ اتنی بیہودہ اور فضول ہوتی ہیں کہ خواہ مخواہ تم پر اور تمھاری پولیس پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

پہلا مسافر:۔ "تو آپ کے خیال میں قتل کے لئے کوئی سامان نہیں چاہیئے۔ اگر سامان نہ ہو تو قتل کا نشان کیونکر باقی رہے اور نشان باقی نہ رہے تو سُراغ کیسے لگے ؟"

دوسرا مسافر:۔ "اِسی لئے تو کہتا ہوں کہ یہ تمھارے دماغ کا فتور ہے۔"

پہلا مسافر۔ ذرا بگڑ کر۔ "معاف کیجئے میں اِس قسم کی گفتگو کا عادی نہیں ہوں"

دوسرا مسافر۔ "میں خوب جانتا ہوں کہ تم اس قسم کی گفتگو کے عادی نہیں ہو کیونکہ غیر معمولی شہرت نے تمھارا دماغ بگاڑ دیا ہے۔ جب تم نے اپنا پہلا افسانہ "شکاری اور شکار" لکھا تھا تو میں نے اوّل سے آخر تک اُسے دلچسپی سے پڑھا اور یہ خیال کیا تھا کہ تمھارے دماغ میں ایک عمدہ فسانہ نگار ہونے کے جراثیم موجود ہیں۔ بشرطیکہ سستی مقبولیت اور جاہل عوام کی تعریفوں کے فریب میں گرفتار ہو کر یہ خوبی کھو نہ بیٹھو۔ مگر ہوا وہی جس کا مجھے خیال تھا۔ جب تمھارے افسانوں کی مانگ بڑھی اور پبلشرز نے اُس مانگ کو دیکھ کر تمھارے افسانوں کے معاوضہ میں بڑی بڑی رقمیں پیش کرنی شروع کر دیں تو تم نے محنت کرنی چھوڑ دی اور بلا سوچے سمجھے جو کچھ سمجھ میں آیا لکھ مارا۔ شہرت ایک دفعہ ہو چکی تھی۔ عوام میں بُرے بھلے کی تمیز نہیں ہوتی۔ پبلشرز اپنے پیٹ کی خیر مناتے ہیں۔ اِس لئے تمھاری تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں اور اس اخبار میں بھی تو جو تمھارے سامنے پڑا ہے احمق ایڈیٹر نے بغیر کتاب پڑھے ایک لمبا چوڑا ریویو شائع کیا ہے۔" کچھ دیر تو تحمّل سے پہلا مسافر مجذوب کی بڑ سمجھ کر یہ سب کچھ سُنتا رہا۔ کبھی کبھی طرارہ آتا تو یہ دل چاہتا کہ اس شخص کے مُنہ پر ایک چانٹا رسید کرے۔ مگر پھر اپنا ڈھیلا پن اور اُس کا کسرتی جسم دیکھ کر ہمت

چھوٹی جاتی تھی۔ بغیر پڑھے ہوئے ریویو کی پھبتی سُن کر وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ "یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ایڈیٹر نے بغیر پڑھے ہوئے ریویو کیا ہے۔"

دوسرا مسافر"۔ اتنی دیر میں تم نے ایک سمجھ کی بات کی ہے۔ لو سُنو اپنے ایڈیٹر کی مجرمانہ حرکت کا ثبوت۔ اول تو ریویو میں اُس شخص نے مصنف پر تو ساڑھے اُنیس سطروں میں تبصرہ کیا ہے۔ برخلاف اس کے خود کتاب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ پونے چھ سطر میں آیا ہے۔ اس میں بھی جو کچھ لکھا ہے اُس سے بھی کتاب کی خوبی یا خرابی کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔ یہی الفاظ ہر کتاب پر منطبق کئے جا سکتے ہیں۔ پہلی تعریف تو یہ کی ہے کہ کردار نگاری غضب کی ہے۔ اب کردار نگاری میں جو غضب تم نے ڈھایا ہے وہ بھی سُن لو۔ اس کتاب کے صفحہ ۴۱ سطر ۹ میں آپ نے ڈاکٹر کی عمر ۷۰ سال فرمائی ہے۔ ۶۹ صفحہ پر سطر ۱۴ میں اُسی سال کا دوسرا واقعہ لکھتے ہوئے اسی ڈاکٹر کے متعلق کہتے ہو کہ اُس کا پوتا بی۔اے کر چکا ہے اب حماقت ملاحظہ ہو کہ جس شخص کی عمر ۲۰ سال ہو اُس کا پوتا کس طرح بی۔اے کر سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ صفحہ ۱۰۱ پر اسی ڈاکٹر کے متعلق ذکر کرتے ہو کہ اس کو مطب کرتے ہوئے ۲۷ سال گذر چکے ہیں۔ گویا آپ کے خیالِ مبارک میں یہ ڈاکٹر صاحب پیدا ہی ڈاکٹر ہوئے تھے۔ یہی ڈاکٹر ایک جگہ تو اس قدر سنگدل دکھایا گیا ہے کہ غریب بیمار اُس پر جس قدر اپنے افلاس کا اظہار کر کے مدد کا طالب ہوتا ہے اُسی قدر ڈاکٹر سخت کلامی سے پیش آتا ہے اور اگلے منظر میں وہ

رحم کا دیوتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ دو مثالیں ہیں آپ کی کردار نگاری کی جس کی اور بہت سی مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ سچ ہے" دروغ گورا حافظہ نباشد"

پہلا مسافر۔ کچھ شرما کر۔" آپ کو معلوم نہیں کن حالات میں مَیں نے یہ کتاب مرتب کی تھی۔ دو ماہ سے میں گٹھیا کے مرض میں مبتلا تھا مگر چونکہ معاوضہ پیشگی وصول کر چکا تھا اور میعاد گذری جاتی تھی اس لئے مجبوراً بیماری کی حالت میں مَیں نے کسی شخص کو اس کا مسودہ لکھوا دیا تھا نظر ثانی کی بھی مہلت نہیں ملی۔"

دوسرا مسافر۔ ایک قہقہہ لگا کر۔" اور معاوضہ کیا ملا تھا؟"

پہلا مسافر۔ "تین ہزار روپیہ۔"

دوسرا مسافر۔ "تین ہزار روپے کے بدلے یہ لغویت خریدی گئی؟"

پہلا مسافر۔ "ہاں مگر پبلشر کو اس میں کوئی نقصان نہیں رہا کیونکہ اسی سال کے اندر اندر دس دس ہزار کے دو ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں یہ تیسرا ایڈیشن ہے جس کے لئے پبلشر نے ریویو کرایا ہے۔"

دوسرا مسافر۔ "مگر تم نے اس پر بھی غور کیا کہ پبلشر تو محض ایک دلّال کی حیثیت رکھتا ہے اور تم نے جو غداری کی اُس کے لئے تم پبلک کو جواب دہ ہو جس کے مذاق کو تم نے خراب کیا اور بیماری کا عذر قابل پذیرائی ہرگز نہیں۔ جو نقائص میں نے اس کتاب میں بتائے وہ کم و بیش تمھاری ہر کتاب میں پائے جاتے ہیں۔"

پہلا مسافر۔ ذرا تیز ہو کر۔" کیسے؟"

دوسرا مسافر۔ "تمھارے فسانے "پہاڑی بیوی" میں صفحہ ۱۵ سطر ۱۲ میں تم نے پہاڑی بیوی کے خصائل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ بہت سادہ مزاج، خوش خلق، شیریں گفتار اور محبت کرنے والی لڑکی تھی واقعات سے یہ تمام خصائل بالکل غلط ثابت ہوئے۔ ایک سال کے بعد اُس نے شادی کی اور تین سال کے بعد ڈاکوؤں کے گروہ سے سازش کر کے اپنے شوہر کو قتل کرا دیا۔ انجام کار خود اُسے پھانسی ہوئی پھانسی کے بعد آپ وعظ فرماتے ہیں اور صفحہ ۴۷ کی سطر ۷ میں اُس عورت کو جفاکار اور سنگدل کہہ کر کوستے اور اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہیں۔ بتاؤ کیا اسی کا نام کردار نگاری ہے؟"

پہلا مسافر۔ "مگر میرا مطلب یہ تھا کہ وہ حقیقت میں تو سنگدل ہی تھی۔ اُپنے شوہر کی نظر میں ابتدا میں وہ ایسی ہی معلوم ہوتی تھی جیسا میں نے بیان کیا ہے۔"

دوسرا مسافر۔ فضول تاویل مت کرو۔ تمھارے افسانے "مزدور" میں صفحہ ۱ سطر ۱۱ میں ہیرو کے خاندان پر جو مصائب سرمایہ داری کے ہاتھوں نازل ہو رہی تھیں بڑے دردناک طریقے پر بیان کی ہیں مگر اُس کے فوراً بعد تم نے اُس کی بیوی کی زبان سے اُس کی خالہ کا ایک طویل قصہ بیان کیا۔ حالانکہ فسانے کے اصلی موضوع سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ تم کہو گے کہ صفحہ ۷ سطر ۲ میں اسی خالہ کے بیٹے کے ہاتھوں سے جو پولیس کانسٹیبل تھا اپنے ہیرو پر خوفناک مظالم کرائے ہیں

مگر میں کہوں گا کہ اُس خالہ کے بیٹے ہی پر کیا منحصر تھا ہر پولیس کا سپاہی اس کے لئے موزوں تھا۔ اس خالہ والے قصہ کو بیچ میں ٹھونسنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اصل قصہ پھر شروع ہوا تو وہ دردانگیز اثر جو پہلے مرقع سے قاری کے دل پر طاری ہو چکا تھا زائل ہو گیا اور خیر اس قسم کی غلطیاں تو سمجھ دار لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ مثال کے طور پر اسی افسانے "مزدور" میں ۲۵۹ غلطیاں صرف و نحو کی، ۵۳۹ محاورے کی ۲۰۳ سیاق و سباق کی اور بے شمار رسم الخط اور اِملا کی موجود ہیں مگر اِملا کی غلطیوں کو تو یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ کمبخت کاتب نے کر دی ہوں گی۔"

پہلا مسافر۔ واقعی محظوظ ہوتے ہوئے۔ "آپ نے میرے افسانے حفظ کر رکھے ہیں۔ آپ کی اس قدر دانی کا مجھے ضرور شکر گذار ہونا چاہئے۔ مگر شاید آپ بھی افسانہ نگار معلوم ہوتے ہیں؟"

دوسرا مسافر۔ "ہر گز نہیں۔ میں نے آج تک یہ حماقت کبھی نہیں کی۔ ہاں یہ بات میں ضرور کہوں گا کہ قتل کے لئے جس قدر ساز و سامان کی تم لوگوں کو ضرورت پیش آتی ہے، ہر گز ضروری نہیں اور پولیس بھی احمق ہے جو ہر قتل کے لئے کسی نہ کسی غرض کا ہونا ضروری سمجھتی ہے کیونکہ قتل تفریحاً بھی کیا جا سکتا ہے۔"

پہلا مسافر۔ "صاحب یہ منطق تو ہماری سمجھ میں نہیں آئی ذرا وضاحت کے ساتھ بیان فرمائیے۔"

دوسرا مسافر۔ "مثال دے کر سمجھاؤں ؟"

پہلا مسافر۔ "ہاں فرمائیے"۔

دوسرا مسافر۔ "لیجئے سنئے! یہ کہہ کر دوسرے مسافر نے ایک بیش قیمت طلائی سگریٹ کیس اپنی جیب سے نکالا اور ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ سگریٹ کیس پہلے جیب میں رکھ لیا پھر دو چار کش لگا کر پھر سگریٹ کیس باہر نکالا اور کہنے لگا۔" دیکھئے یہ سلطانہ سگریٹ ہے جو آپ کو خاص طور سے مرغوب ہے اور جس کے لمبے لمبے اشتہاروں میں جو ہر روز ملک کے بڑے بڑے اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں آپ کی تصویر بھی چھپتی ہے اور آپ کا سرٹیفکٹ بھی چھپتا ہے اسی لئے تو میں اسے استعمال کرتا ہوں"۔

پہلا مسافر۔ قہقہہ لگا کر۔" جناب یہ ایک تجارتی راز ہے میں نے آج تک کبھی سلطانہ سگریٹ نہیں پیا لیکن چونکہ سگریٹ کمپنی نے مجھے اس سرٹیفکٹ اور تصویر کا ایک معقول معاوضہ پیش کیا تھا اس لئے میں نے انہیں اجازت دے دی۔ میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ اچھا ہے یا بُرا"۔

دوسرا مسافر "لیجئے اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو آج اس کا ذائقہ چکھ لیجئے"۔

پہلے مسافر نے یہ سوچ کر کہ جس سگریٹ کی تعریف کا سرٹیفکٹ اُس نے دو سال پہلے دیا تھا ذرا دیکھئے تو سہی کہ وہ کس ذائقہ کا ہے۔ اگرچہ

سرٹیفکٹ دیتے ہوئے بھی کمپنی نے تحفتہً ان کو بڑے تکلّف سے بارہ ڈبوں کا ایک بکس پیش کیا تھا مگر اس وقت انہوں نے یہ ڈبہ ایک دوست کی نذر کر دیا تھا۔ سگریٹ لے کر سلگایا۔ دوسرے مسافر نے اطمینان سے اپنا مختصر بستر کھولا اور اس کے تسمے کے ساتھ کھیلتے ہوئے یوں کہنا شروع کیا۔ "فرض کیجئے کسی ریل کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں صرف دو مسافر سفر کر رہے ہوں اور دونوں بالمقابل اسی طرح بیٹھے ہوں جیسے میں اور آپ۔ اچھا اب فرض کیجئے کہ ایک مسافر کے پاس صرف چار چیزیں ہوں گھیس، کمبل، تکیہ، تسمہ۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ چاروں چیزیں ذرا بھی غیر معمولی نہیں اور ہر امن پسند مسافر کے پاس ہو سکتی ہیں۔ دونوں مسافروں میں گفتگو ہوتی رہے۔ پھر ایک مسافر دوسرے مسافر کو سگریٹ پیش کرے۔ دوسرا مسافر عزت سمجھ کر قبول کرے۔ سگریٹ پیتے ہی اس پر نشہ ساطاری ہو جائے اور دوسرا مسافر اس کے گلے میں تسمہ ڈال کر۔"

یہ کہتے ہوئے اس شخص نے فسانہ نگار کے گلے میں تسمہ کی پھانسی ڈال دی۔ سگریٹ کے خوفناک نشہ نے اس کے اعصاب کو بالکل بیکار کر دیا تھا مگر دماغ ابھی اس افسانے کی اصلیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے بچانے کی بہت کمزور کوشش کی مگر زبان اور آنکھیں باہر نکل آئیں۔ دوسرے مسافر نے اب اس کو دونوں بنچوں کے بیچ میں لٹا کر اپنا تکیہ اس کی

گردن پر رکھا اور تکیئے کے اوپر خود بیٹھ گیا۔ اعصاب کی کشمکش چند منٹ
جاری رہی اور ختم ہو گئی۔ پورا اطمینان کرنے کے بعد وہ شخص اٹھا تسمہ
گردن سے باہر نکالا۔ اطمینان سے بستر باندھا۔ کمبل گلے میں لپیٹا تمام
کھڑکیاں بند کیں اور بڑے اطمینان سے رائے ونڈ کے سٹیشن پر جو آدھ
گھنٹہ کے بعد آیا یہ شخص گاڑی سے اُترا۔ مسافروں میں مل گیا اور پانچ چھ
گاڑیاں چھوڑ کر دوبارہ ایک کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گیا جہاں تین مسافر
پہلے سے موجود تھے مگر رات کا وقت ہونے کی وجہ سے سب بے خبر
سو رہے تھے۔

صبح چھ بجے کے قریب گاڑی بھاول پور پہنچی اور ڈائننگ کار کے
ایک ملازم نے اُس کمپارٹمنٹ میں جھانکا جس میں گذشتہ رات قتل
ہوا تھا۔ اُس نے ایک مسافر کو خلاف توقع سیٹ سے نیچے پڑے ہوئے
دیکھ کر بڑا تعجب کیا۔ بہت جلد اُس کا شبہ یقین سے بدل گیا۔ وہ بھاگا
ہوا گارڈ کے پاس گیا اور جلد ہی گارڈ، اسٹیشن ماسٹر، ریلوے پولیس کے
سب انسپکٹر، ریلوے ڈاکٹر سب اس کمپارٹمنٹ میں جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر
نے لاش کو دیکھ کر فیصلہ کیا کہ موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی ہے، مگر
گلے پر کوئی نشان نہ تھا۔ پولیس انسپکٹر نے باحتیاط اور بغور تمام کمپارٹمنٹ
کو دیکھا کہیں اُنگلی کا نشان نہ ملا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ قاتل نے ہاتھوں
پہ دستانے چڑھائے ہوئے تھے۔ قتل کی خبر لگتے ہی باہر سے اندر
آنے اور اندر سے باہر جانے کے لئے اسٹیشن بند کر دیا گیا۔ جتنے آدمی

پلیٹ فارم یا گاڑی کے اندر موجود تھے سب کو پولیس نے گھیر کر بیانات قلمبند کرنے شروع کر دیئے۔ اس وقت گاڑی میں ۱۲۹ آدمی سفر کر رہے تھے اور تقریباً سو آدمی سٹیشن اسٹاف اور مسافروں میں سے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ان سب کے بیانات نام پتے نشان شناخت قلمبند کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاک ڈھائی گھنٹے لیٹ ہو گئی مگر سب کچھ "کوہ کندن اور کاہ بر آوردن" کی مصداق تھا۔ کیونکہ اتنی بڑی تعداد میں افسر تفتیش کو ایک آدمی بھی مشتبہ نظر نہ آتا تھا نہ قتل کی کوئی غرض سمجھ میں آتی تھی سال بھر تک تفتیش کا سلسلہ جاری رہا۔ متوفی کی تنہا وارث اُس کی لڑکی نے بے دریغ روپیہ صرف کیا مگر قاتل کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ پولیس بھی آخر تھک کر بیٹھ گئی اور کاغذاتِ تفتیش فائل کر دیئے گئے۔

(۲)

مرزا سعید الدین اپنے پرائیویٹ دفتر میں بیٹھے بہت مصروفیت سے کچھ فائل دیکھ رہے تھے۔ دروازہ کھلا اور ملازم نے کسی ملاقاتی کا کارڈ پیش کیا۔ جس کو مرزا صاحب نے فوراً ہی بُلا لیا۔ یہ شخص بالکل نوجوان اور بہت خوش پوش تھا۔ چہرے کی ساخت اور چال ڈھال دیکھ کر خواہ مخواہ دلچسپی پیدا ہوتی تھی۔ مرزا صاحب نے متجسس نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے پہلے چاروں طرف کمرے کو دیکھا کئی بار آرام دہ صوفے پر پہلو بدلے۔ جیب سے سنہری گھڑی نکال کر وقت

دیکھا اور اُس گھنٹے سے وقت کی مطابقت کی جو اس کمرے میں لگا ہوا تھا پھر ایک تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے زیرِلب کچھ گنگنانے لگے مرزا صاحب جن کا وقت بے حد قیمتی تھا اور جو اپنے گاہکوں سے یہی توقع رکھتے تھے کہ وہ مطلب کی بات کہیں اور چلے جائیں۔ گاہک بھی وہی لوگ ہوتے تھے جو کسی جرم کی تفتیش کے سلسلہ میں جب پولیس عاجز آجاتی تو ایک قابل ہونہار مستعد نوجوان سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنا چاہتے۔ کیونکہ تنخواہ دار سرکاری سراغ رسانوں کی بہ نسبت وہ کہیں زیادہ دلچسپی کے ساتھ اُن کا کام کرتا تھا۔ ایسے لوگ خود بھی اپنے مطلب کی بات جلد از جلد کہہ دینے کے لئے بے چین ہوا کرتے ہیں۔ مرزا سعید الدین نے آخر گھبرا کر پوچھا۔ "فرمائیے"۔

مُلاقاتی ۔ "جی کیا فرمایا جناب نے؟ میں ذرا اِس تصویر کے آرٹ پر غور کر رہا تھا"۔

مرزا صاحب ۔ "آپ کو معلوم ہے میں بہت مصروف ہوں اِس لئے اگر جناب اپنی تشریف آوری کی غایت جلد ہی بیان فرما دیں تو میں بہت ممنون ہوں گا"؟

مُلاقاتی ۔ میرے ایک دوست نے آپ کی تعریف کی تھی۔ اس لئے آپ کے پاس آیا ہوں ایک خاص معاملہ میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میرے کارڈ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میرا نام شام سنگھ ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو گا گذشتہ سال ایک مشہور

فسانہ نگار محسن کا قتل ہوا تھا جس کے قاتل کا سُراغ لگانے سے پولیس قاصر رہی۔"

مرزا سعید الدین نے بغیر کچھ جواب دیئے ہوئے اپنی میز پر سے ایک فائل اٹھایا اور اُس کے اوراق کو اُلٹ پلٹ کر ایک یادداشت نکالی اور یوں پڑھنا شروع کیا:۔

"۷ار دسمبر ۱۹۳۵ء کو کراچی میل کے ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں محسن نامی مشہور فسانہ نگار کا قتل لاہور اور بھاول پور کے درمیان ہوا تھا۔ پولیس نے قاتل کا پتہ لگانے کی بہت جد وجہد کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔"

شام سنگھ۔ "آہا تو آپ کو بھی اس مقدمہ سے دلچسپی معلوم ہوتی ہے؟"

مرزا صاحب۔ "چونکہ میرا پیشہ سُراغ رسانی ہے، اس لئے جس قدر ایسی سنگین وارداتیں ہوتی ہیں جن کا پتہ پولیس آسانی سے نہ لگا سکے اُن کی مختصر کیفیت میرے ایجنٹ کے ذریعہ میرے پاس آتی رہتی ہے اور جب کوئی گاہک آتا ہے تو مجھے اپنے معاملہ سے شاذ و نادر ہی ناواقف پاتا ہے اب آپ فرمائیں کیا چاہتے ہیں؟"

شام سنگھ۔ "میں کہہ تو دوں مگر آپ میرا مذاق اُڑائیں گے۔"

مرزا صاحب۔ "یہ بات میرے پیشے کے خلاف ہے۔ آپ بلاخوف فرمائیں۔"

شام سنگھ۔ "ہمارے خاندان کی ایک خصوصیت ہے۔ اس خاندان کے جتنے افراد ہیں اُن سب کے دماغ میں تھوڑا بہت فتور ضرور ہے اور اکثر ہم ایسی باتیں کہا کرتے ہیں جو عام انسانوں کے نزدیک خلافِ عقل۔

ہوں، یا کم از کم لایعنی اور فضول ہوں۔ اس لئے جو کچھ میں بیان کروں آپ
اُس پر تعجب نہ کریں۔ میرے ایک چچا ہیں۔ ہری سنگھ ادھیڑ عمر کے آدمی
ہیں۔ فسانہ نویسی کا تو نہیں مگر فسانہ خوانی کا اُنہیں بہت شوق ہے۔ آج
صبح اُن سے ایک عجیب بحث چھڑی۔ وہ کہتے تھے کہ "ہمارے ملک کی پولیس
نہایت ناقابل ہے اور اس ملک کے قاتل بھی بڑے نالائق ہیں۔ ورنہ
پولیس تو شاید ایک قتل کا بھی سُراغ نہ لگا سکتی۔" میں نے کہا "پولیس اُن
مقدمات کا سُراغ نہیں لگاتی جس میں مقتول کے رشتہ دار اُسے رشوت
نہ دیں، یا قاتل کی طرف سے کوئی بڑی رقم پہنچ جائے۔" میرے اس بیان
کی تکذیب کرتے ہوئے اُنھوں نے مثال کے طور پر محسن والا معاملہ پیش
کیا۔ میں نے کہا۔ "آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ قاتل کا سراغ اس معاملہ میں
لگے گا ہی نہیں؟" وہ بولے۔ "اگر کوئی قاتل کا سُراغ لگا دے تو میں تمھیں
دس ہزار روپیہ دوں گا۔" میں نے پوچھا۔ "اور اگر پتہ نہ لگا؟" تو کہنے لگے
کہ "دو ہزار روپیہ تم مجھے دینا۔" میں نے مہلت مانگی تو سال بھر کی مہلت
بھی دے دی اور معاملہ اس حد تک بڑھا کہ دیکھئے یہ تحریر بھی لکھ کر دے
دی۔ اب اگر آپ مہربانی کر کے اُس قاتل کا پتہ چلا سکیں تو شرط کی نصف
رقم یعنی پانچ ہزار میں آپ کو پیش کروں گا۔" مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا
"اور اگر پتہ نہ چلا سکوں تو جو جرمانہ آپ پر ہوگا اُس کا نصف حصہ میں دوں۔"

شام سنگھ۔ "جی نہیں یہ تو میں نہیں کہہ سکتا مگر یہ ضرور عرض
کروں گا کہ دو ہزار روپے کے نقصان سے مجھے آپ ہی بچا سکتے ہیں۔"

(۴۸)

اُسی روز شب کو مرزا سعید الدین نے اپنے دوست اور خفیہ پولیس کے انسپکٹر مسٹر رام مورتی سے ملے جو محسن کے مقدمہ میں خفیہ کی طرف سے تفتیش پر لگائے گئے تھے اور یوں گفتگو شروع ہوئی :-

مرزا صاحب۔ "میں آج آپ کے پاس ایک غرض سے آیا ہوں ۷ار دسمبر سالِ گذشتہ کو مشہور فسانہ نویس محسن کا قتل کراچی میل میں ہوا تھا۔"

رام مورتی۔ "آپ نے ایسا واقعہ مجھے یاد دلایا ہے جس کا نام سُنتے ہی میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ ایسا سیدھا سادہ معاملہ اور باوجود انتہائی کوشش کے قاتل کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ عقل حیران ہے قتل کا بظاہر کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا ہے"

مرزا صاحب۔ "خیر یہ افسوس آپ کرتے رہیں۔ مجھے تو دفتر کے نام ایک چٹ لکھ دیجئے۔ تفتیش کی فائل دیکھنا چاہتا ہوں۔"

رام مورتی۔ "چٹ تو میں لکھ دوں گا مگر یہ تو بتائیے کہ گڑے مُردے اُکھاڑنے سے کیا فائدہ؟ ہم اس وقت جب یہ واقعہ ہوا ہی تھا پتہ نہ لگا سکے تو اتنا عرصہ گذرنے کے بعد اور تمام نشانات مٹ چکنے کے بعد اب کیا سُراغ لگے گا؟"

مرزا صاحب۔ "وقت کی بات ہے ممکن ہے کوئی نئی بات سُوجھ جائے ...."

اگلے روز مرزا صاحب نے ایک گھنٹے تک تمام فائل کا دفتر میں مطالعہ کیا اور آخر میں مندرجہ ذیل تحریر ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کے اخبار کی ایک کٹنگ سے جو فائل میں موجود تھی نقل کر لی:-

"جناب ایڈیٹر صاحب۔ تسلیم!

آج کل محسن کے قتل کے متعلق جو واقعات شائع ہو رہے ہیں اُن کو پڑھ کر مجھے خیال پیدا ہوا کہ آپ کے مؤقر اخبار کے ذریعے میں پولیس کی ناقابلیت کی طرف پبلک کی توجہ مبذول کراؤں، واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی پولیس ہر قتل میں وجہ کی تلاش کرتی ہے اور یہ چیز اُن لوگوں کے دماغ میں سما ہی نہیں سکتی کہ قتل بلا وجہ بھی ہو سکتا ہے انہوں نے اپنے زعم باطل میں قتل کے اغراض میں سے چوری، حسد یا بوالہوسی میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ کا موجود ہونا لازمی سمجھ رکھا ہے اس کے علاوہ کوئی ادبی خیال اُن کے ذہن میں آنا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا موری کے کیڑے کو مُشک وغیرہ کی خوشبو آنا۔ اُن کو آلۂ قتل کی تلاش بھی رہتی ہے۔ قاتل کے نشانِ پا یا انگلیوں کے نشان بھی اُن کو بہت پریشان رکھتے ہیں، مگر جہاں یہ چیزیں سرے سے ہوتی ہی نہیں وہاں یہ اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ جس ٹرین میں یہ واقعہ پیش آیا تھا میں خود اُس میں موجود تھا اور جس وقت پولیس بیانات قلمبند کر رہی تھی میں اُس کی حماقت پر ماتم کرتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ قاتل جو یقیناً اِن تین سو آدمیوں میں ملا ہوا ہے، اگر آلۂ قتل اُس کے

پاس نہیں تو وہ کیونکر پہچانا جا سکے گا" +

میں ہوں آپ کا مخلص

ہری سنگھ

یہ کٹنگ اور دوسری بیسیوں کٹنگز کے ساتھ فائل میں موجود تھی۔ مگر مرزا سعید الدین کی دُور بین نظروں نے صرف اس کا انتخاب کیا اور اسی کے ذریعے سے تفتیش کا سلسلہ شروع کیا۔ اُنہوں نے ہری سنگھ کے اِس خط اور ہری سنگھ کی شام سنگھ کے ساتھ شرط کو ملا کر اس طرح نتیجہ اخذ کیا جیسے دو اور دو چار۔ اگلے روز صبح کی ڈاک سے ہری سنگھ کو ایک خط موصول ہوا جس کا مضمون یہ تھا:۔

"مکرمی تسلیم!

آپ میرا خط دیکھ کر ذرا بھی تعجب نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کی قابلیت کا معترف ہو چکا ہوں اور ۷ ار دسمبر کی رات کو جو دعویٰ آپ نے پیش کیا تھا مجھے اب اُس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں۔ مگر چاہتا یہ ہوں کہ ایک بار اور آپ اپنے تجربے کو پیش کریں تاکہ چند شبہات جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی دور ہو جائیں اور آئندہ افسانے لکھتے وقت میں آپ کی ہدایات سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکوں۔ سال بھر کا انتظار بہت سخت تھا مگر تجربے کو مکمل کرنے کے لئے یہ انتظار بھی ضروری تھا ورنہ مجھے کیونکر یقین آتا کہ ایک ماہر فن کے لئے ساز و سامان کی ضرورت ہرگز نہیں اور بغیر ساز و سامان پولیس کی جد و جہد بے سود ہے۔ مزید تفصیلات

بر وقت ملاقات عرض کروں گا جو ۹ر مارچ ۱۹۳۷ء کو کراچی میل میں لاہور سے روانہ ہو کر راستے میں ہو گی، آپ سے ملاقات کا منتظر رہوں گا۔ اُمید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہ کریں گے ؎

خاکسار **محسن**

۹ر مارچ ۱۹۳۷ء کو جب کراچی میل لاہور سے روانہ ہو چکا تو ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ایک تنہا مسافر بیٹھا ہوا تھا۔ چاروں طرف اُس کا سامان کھلا پڑا تھا۔ کچھ کتابیں اور اخبار بھی ایک طرف رکھے تھے۔ یہ مسافر دراز قامت، گندمی رنگ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا داڑھی مونچھ صاف۔ چندیا کے بال بھی اُڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کو محسوس ہوا کہ پاخانے کا دروازہ آہستہ کھلا۔ اُس نے دیکھا کوئی شخص ایک پُرانا سوٹ پہنے گلے میں کمبل لپیٹے باہر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بنڈل تھا جس پر ایک چمڑے کا تسمہ بندھا تھا اُس نے اطمینان سے چمڑے کا تسمہ کھولا اور بنڈل میں سے ایک کھیس اور تکیہ نکال کر سرھانے رکھا اور سہارا لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پہلے مسافر نے سُنا کہ اُس کا ہم سفر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ "جہاں تک قتل کی وارداتوں کا تعلق ہے بعض سُراغ رسانی کے افسانے لکھنے والے عجیب حماقتیں کیا کرتے ہیں۔" یہ سُن کر اُس نے جواب میں کہا۔ "یہ بیان ایک دفعہ اور تجربے کا محتاج ہے۔ اگر براہِ کرم اِس کے لئے آپ تیار ہوں۔"

جواب۔ "بڑی خوشی سے! فرض کیجئے دو مسافر ایک گاڑی میں سفر کر رہے ہوں۔ اُن میں سے ایک دوسرے کو ایک سگریٹ پیش کرے جیسا عام طور پر ہوا کرتا ہے اور جس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے ہری سنگھ نے سگریٹ پیش کیا جو بھولے بھالے مسافر نے بغیر کسی شبہ کے لے کر سلگایا۔ مگر ایک ہی کش لیا تھا کہ فوراً اُس کو پتہ چل گیا کہ سگریٹ میں کوئی منشی چیز موجود ہے۔ سگریٹ اُس کے ہاتھ سے گر پڑا جس کو اُٹھانے کے لئے وہ نیچے جھکا اور اسی دوران میں نہایت پھرتی سے اُس نے یہ سگریٹ بجھا کر آستین میں چھپا لیا اور دوسرا سگریٹ اپنی جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ ہری سنگھ کو ذرا بھی شبہ نہ ہوا کہ سگریٹ بدل لیا گیا ہے۔ وہ تو صرف یہ سمجھا کہ سگریٹ اتفاقیہ طور پر گرا اور گر کر بجھ گیا۔ لہٰذا علی محسن نے دوبارہ سلگا کر پینا شروع کیا اور جان بوجھ کر جھومنے لگا۔ ہری سنگھ نے سلسلۂ کلام یوں جاری رکھا۔ "جب سگریٹ کا اثر ہو چکا تو سگریٹ دینے والے مسافر نے اپنے بستر کا تسمہ اپنے اُن ہاتھوں میں لیا جن میں دستانے پہنے ہوئے تھا اور حلقہ بنا کر پھرتی کے ساتھ اپنے ہم سفر کے گلے میں اس طرح ڈال دیا۔"

یہ کہتے ہوئے ہری سنگھ نے چمڑے کے تسمہ کی پھانسی اپنے ہمسفر کے گلے میں ڈالی۔ مگر بدنصیبی سے اب اُس کا حریف مخمور و بے بس محسن نہ تھا بلکہ چست و چالاک سُراغ رساں مرزا سعید الدین تھا جس نے

دونوں ہاتھوں سے تسمہ تھام لیا۔ اب ہری سنگھ پر دھوکے کا راز افشا ہو گیا، مگر جو کچھ وہ کر چکا تھا جوشِ جنون میں اُسے مکمل ہی کرنا چاہتا تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنے بھاری بوجھ کا وزن ڈال کر سعید الدین کو نیچے گرا ہی لیا اور چاہتا تھا کہ پھانسی کا پھندا تنگ کرے یہ کشمکش جاری تھی کہ وہ دروازہ کھلا جو اُس کمپارٹمنٹ کو ایک اور چھوٹے کمپارٹمنٹ سے مِلاتا تھا اور دو باوردی پولیس مَین داخل ہوئے۔ ہری سنگھ نے بھرے ہوئے شیر کی طرح مقابلہ کیا لیکن تینوں نے مِل کر اُس کی مُشکیں باندھ لیں۔

عدالت میں ہری سنگھ نے سب کچھ اقبال کر لیا اور پھانسی ڈالنے کے بعد جو کچھ اُس نے غریب محسن کے ساتھ کیا تھا وہ بھی ظاہر ہو گیا ÷

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام شیخ محمد اسمٰعیل
پانی پتی پرنٹر و پبلشر چھپکر پانی پت سے شایع ہوئی۔